نایاب جیلانی
میں تمھاری پیا

میں ہاری پیا

نایاب جیلانی

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 37352332-37232336

پیش لفظ

کہانی کار کہانی تخلیق کرنے کے دوران کئی مرحلوں سے گزرتا ہے۔ کہانی کار کا دماغ اس کے لیے ''معبر'' کی طرح ہوتا ہے۔ لفظوں کا معبر، جسے عبور کر کے حرف، لفظ اور جملوں کی جوڑ توڑ ایک افسانے، ناول یا داستان کا پل بناتی ہے۔ ہر تخلیق کار کے لیے اپنی تخلیق بنیادی طور پر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم میرے لیے کہانی اہمیت نہیں رکھتی، قاری اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کہانی کار صرف لفظوں کی بازی گری جانتا ہے اور قاری لفظ کی شہ رگ پکڑتا ہے۔ چاہے تو تخلیق کار کی ''محنت'' کو آسمان پہ پہنچا دے، چاہے تو ''پاتال'' میں گرا دے۔...... کہانی تخلیق کے ''مرحلے'' سے گزر کر ''قاری'' کی نگاہ میں اپنا ''مقدر'' تلاشتی ہے۔ یہ عروج پائے گی یا زوال؟ قاری کی معاملہ فہمی، نظر شناسی، اور نکتہ اسی کی صوابدید پہ ہے۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد ادارہ علم و عرفان نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

نایاب جیلانی

میں ہاری پیا

ائیر پورٹ کی پرشکوہ عمارت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ گاڑی اب کھلی شفاف سڑک پر رواں دواں تھی۔ سفید نئے ماڈل کی کرولا کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ گاڑی پاپا کے دوست کی بیٹی سویرا نے اس کے آنے سے پہلے ہی خریدی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے وہ سویرا کو بھاری بھرکم رقم کا چیک پکڑا کر آئی تھی۔

وہ شروع سے ہی آرام طلب تھی۔ لوکل بسوں اور ٹیکسوں کے سفر سے اسے شروع سے ہی نفرت تھی بلکہ اسے تو اس جگہ سے بھی نفرت تھی جہاں اس وقت وہ خود اپنی مکمل دلی رضا مندی کے ساتھ جا رہی تھی۔

''بھلا ایسے...... ہوسکتا ہے کہ اشفا ہارون کا دل پلٹ جائے۔'' بہت سال پہلے کی یہ بات تو نہیں کہ ''حیات آباد'' کے مکین اس کے حقارت میں کہے گئے ان الفاظ کو بھلا چکے ہوں بلکہ وہ تو یقیناً اسے اپنے گھر دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اشفا ہارون اب ہمیشہ کیلئے یورپ کے سحر سے آزاد ہو کر ان کے درمیان رہنے کیلئے آ گئی ہے اس کا بھرپور تمسخر اڑائیں گے۔ وہ ان تمام راستوں سے انجان ہونے کے باوجود ایک مرتبہ بھی راستہ نہیں بھولی تھی۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے اس کی بے قرار نگاہیں سبز پینٹ کئے بورڈ سے ٹکرائیں تو دل اک پل کیلئے دھڑکنا بھول گیا۔

''ڈیرہ مرتضٰی حیدر۔'' وہ کئی لمحے ان افاظ کو زیر لب دہراتی رہی تھی۔ چھ سال پہلے وہ اس شخص سے شدید ترین نفرت کرتی تھی مگر اب چھ سال بعد یہ دل اسی ایک شخص کی محبت سے لبریز تھا۔

''اگر اسے مرتضٰی حیدر سے ہی محبت ہونا تھی تو یہ محبت چھ سال پہلے کیوں نا اس کے دل میں انگڑائی لے کر جاگی۔'' یہ ایسا سوال تھا جو وہ پچھلے کئی مہینوں سے خود سے کر کر کے تھک چکی تھی۔

اسے یاد تھا پہلی مرتبہ اسی سڑک پر پسینے سے شرابور میلے کپڑوں میں ملبوس مرتضٰی حیدر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت اشفا کے پاپا بھی اس کے ہمراہ تھے۔ پاپا نے ہی مرتضٰی کو پہچان کر گاڑی رکوائی اور پھر بڑے تپاک سے مرتضٰی کو گلے سے لگایا۔ مرتضٰی نے ٹریکٹر کے انجن کو بند کیا اور پھر سفید پگڑی نما چادر جو کہ

شاید دھوپ سے بچنے کیلئے سر اور چہرے کو ڈھانپنے کی غرض سے لی تھی سے اپنا بے حد سرخ سفید چہرہ صاف کیا۔
''آپ گھر چلیں چچا جان! میں ابھی آتا ہوں۔'' مرتضیٰ نے بابا کو مخاطب کرتے ہوئے اک بھرپور نگاہ اس پر بھی ڈالی تھی۔ اشفا کا کوفت و جھنجھلاہٹ سے رواں رواں سلگ اٹھا۔ اسے اپنا یہ کزن قطعاً پسند نہیں آیا تھا بلکہ اسے تو حیات آباد میں بسنے والے مکینوں میں سے کوئی ایک بھی قابل توجہ نہیں لگا تھا اور اس وقت وہ ان سب سے ملنے کیلئے بے تاب تھی۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اک نرم گلابی ننھا وجود' اس کے نقش بھی اس نے غور سے نہیں دیکھے تھے بار بار کھلکھلاتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا وہ بے چین ہو کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دیتی۔
''تم کتنی سنگدل ماں ہو۔'' کوئی اس کے کان کے قریب چلایا تو اشفا نے بے ساختہ اپنے سرخ چمکیلے لبوں کو کچل ڈالا۔

''میرا بچہ' میری جان' میرا شازم۔'' اس کے دل میں ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اس ممتا' محبت کو اس نے نفرتوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ایک مرتبہ نمرہ نے کہا تھا کہ ''اشفا تم بہت خود غرض ہو۔'' اور اشفا نے تو بہت عرصہ پہلے ہی اپنی خود غرضی کو تسلیم کر لیا تھا۔
وہ بہت خود غرض تھی' مغرور تھی' خود پسند تھی۔ بے حد ضدی' ہٹ دھرم اور جذباتی تھی۔ ان تمام خوبیوں نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں پچھتاوے ڈسنے لگتے ہیں۔ اس کی سوچوں کو اس وقت بریک لگا جب گاؤں کی حدود اور کچے پکے مکانوں پر نگاہ پڑی۔ حیات محمد کا وہ بہت وسیع و عریض احاطے والا گھر قریب آیا جس کے اندرونی حصے میں بے شمار کمرے اور برآمدے تھے تو اس کا دل نئے سرے سے دھڑک اٹھا۔
یہ بہت بڑا گھر ڈھیروں محبتوں کو سموئے بانہیں پھیلا کے کھڑا تھا مگر چھ سال پہلے وہ اس گھر کو ٹھوکر مار کر اور ان محبتوں سے منہ موڑ کر خود چلی گئی تھی اور آج وہ پھر اسی دروازے پر کھڑی گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھی۔
لکڑی کا بڑا سا دروازہ بند تھا اور اشفا کے ہاتھ دستک کیلئے اٹھ نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا' وہ یونہی چلچلاتی دھوپ میں ہر شے سے بے نیاز کھڑی رہی اور پھر تمام ہمتوں کو جمع کر کے اس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ خود بخود ہی کھلتا چلا گیا۔
وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔ اندرونی دروازے کے قریب اس کے قدم ایک دفعہ پھر زنجیر پا ہو گئے۔

''کیا یہ لوگ مجھے قبول کریں گے۔ تمام تر نافرمانیوں' من مانیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود مجھے ایک دفعہ پھر سینے سے لگا لیں گے' کیا اس گھر کی طرح ان کے ظرف بھی وسیع ہیں۔'' یہ وہ سوال تھے جن کے جواب کم از کم اسے اس وقت بھی نہیں مل رہے تھے جب وہ امریکہ میں ان لوگوں کی یاد اور شازم سے ملنے کیلئے تڑپ رہی تھی۔ ان چار مہینوں کے اندر اندر وہ یعنی اشفا ہارون سر تا پا بدل گئی تھی۔
اس کا دل کیا بدلا' سوچ اور نظریات تک بدل گئے۔ اتنے برسوں سے وہ جس ماحول کا حصہ رہی تھی ایک دم ہی وہ ماحول اجنبی اور پرایا پرایا لگنے لگا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے آشیانے کی طرف اڑ کر پہنچ

جائے مگر بہت سی مجبوریوں کی وجہ سے اسے کچھ عرصہ مزید وہاں رکنا پڑا تھا۔

پاپا کا اتنی محنت' جدوجہد اور انتھک کوششوں سے بنایا گیا وہ مختصر سا ہوٹل بیچ کر اور اپنے بے حد پیارے گھر کو فروخت کر کے وہ اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس گھر میں اس کی بے حد سیدھی اور معصوم سی ماما کی ڈھیروں یادیں تھیں۔ اس کا بچپن اور لڑکپن تھا مگر وہ محض یادوں کے سہارے جینا نہیں چاہتی تھی۔ حقیقی خوشیوں کو پانے کیلئے ہی تو وہ پلٹ آئی تھی' لوٹ آئی تھی مگر نہ جانے یہ مسرتیں اسے میسر آتی تھیں بھی کہ نہیں۔

سفر کی تھکان اب آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ دودھیا گداز مخروطی انگلیوں والے ہاتھوں سے آنکھیں دباتے ہوئے دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہ رہی تھی جب ایک دم ہی اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا تھا اور یہ کوئی اور نہیں مہوش تھی۔ جو کہ نہ جانے کتنے ہی رنگ آنکھوں میں لئے یک ٹک اشفا کو دیکھے جا رہی تھی۔

اشفا نے جھجک کر مہوش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مہوش کے چہرے سے سرخی چھلکنے لگی تھی جبکہ آنکھوں میں نفرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔

حیرت' بے یقینی اور اس کے بعد بے تحاشا ناگواری و نفرت کے اس استقبال نے اشفا کی رہی سہی ہمت کو بھی نچوڑ دیا تھا۔

''کیا لینے آئی ہو یہاں۔'' مہوش نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مم...... میں تم سب سے ملنے' میرا مطلب ہے کہ شازم۔'' اشفا! اس کے سخت الفاظ پر ہکلا کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کا ازلی اعتماد ایک دم اڑنچھو ہو گیا تھا۔ اسکی تمام تر بہادری اور بے خوفی اس وقت صرف ایک ہی ''خوف'' کے زیر اثر تھی کہ یہ لوگ مجھے دھتکار نہ دیں۔ ٹھکرا نہ دیں' کیونکہ شفا ہارون اب کے تمام کشتیاں جلا کر آئی تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنا غلیظ وجود لے کر۔ نفرت ہے مجھے تم سے' اگر غیرت ہوتی تم میں تو کبھی لوٹ کر نہ آتیں مگر تم جیسی عیاش امیرزادیاں بے غیرتی میں ڈگری لئے پھرتی ہیں۔'' مہوش نے دبی آواز میں چیخ کر کہا اور پھر غراتے ہوئے اشفا کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ''نکل جاؤ اس گھر سے' تمہاری اب یہاں جگہ بالکل نہیں ہے۔'' مہوش دو سیڑھیاں مزید نیچے اتر کر غرائی اور پھر اس کا گداز ملائم بازو اپنے شکنجے میں جکڑ کر ایک دفعہ پھر جھٹکا دے کر بولی۔

''اس گھر میں سب تم سے نفرت کرتے ہیں۔ مر چکی ہو تم سب کیلئے' مرتضٰی تمہاری شکل پر تھوکے گا بھی نہیں۔ کس آس' کس امید پر آئی ہو۔ نکلتی ہو یا لگاؤں دو ہاتھ۔'' مہوش تو بپھری شیرنی کی طرح گویا اس پر جھپٹنے کیلئے تیار بیٹھی تھی۔ اتنی توہین' اس قدر بے عزتی۔ اشفا کے سفید گال تپ اٹھے' آنکھیں گلابی سے سرخی مائل ہو گئیں۔

''مم' مجھے شازم سے ملنے دو۔'' اس نے لڑکھڑائی آواز میں کہا تو مہوش ایک مرتبہ پھر چنگھاڑی۔

''کون شازم! کوئی تعلق نہیں تمہارا شازم کے ساتھ' اب دفع ہو جا۔ ورنہ بالوں سے گھسیٹ کر باہر

پھینک آؤں گی۔ جا چلی بھی جا۔'' مہوش کو یہ بھی خوف تھا کہ اندر سے دادی یا تائی میں سے کوئی اٹھ کر نہ آ جائے۔کسی کے بھی آنے سے پہلے وہ اس عذاب کو نکال دینا چاہتی تھی۔

''میں چلی جاتی ہوں' مگر مجھے میرے بچے سے ملنے دو۔ میں ایک مرتبہ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' آنکھوں سے بہتے آنسو' لبوں پر التجا مگر سامنے کھڑی عورت نہ دیکھ رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ وہ بس جلد از جلد اسے گھر سے نکال دینا چاہتی تھی مگر کیوں؟

اشفا کے حواس ٹھکانے ہوتے یا پھر وہ پہلے والی حد درجہ حاضر جواب' منہ پھٹ اور بااعتماد اشفا ہوتی تو ایک مرتبہ ضرور مہوش سے سوال کرتی کہ میرا اس گھر کے مکینوں سے کچھ اور بھی رشتہ ہے اور میں بھی اس گھر میں تمہاری طرح برابر کے حصے دار ہوں مگر اس کے لبوں پر تو قفل لگ چکے تھے۔ اس کی خاموش التجاؤں کا مہوش پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اشفا نے تھکی تھکی نگاہ اس کے پتھریلے تاثرات والے چہرے پر ڈالی اور پھر لرزیدہ قدموں سے پلٹنے لگی۔ اسی پل بیرونی دروازے کھلا تایا ابا اپنی ہی دھن میں اندر آئے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔

سامنے آنسوؤں سے تر چہرے لئے اشفا کھڑی تھی۔ ان کی بھتیجی اشفا' ان کے پیارے بھائی کی اکلوتی بیٹی اور ان کی بہو تھی۔

ان کے لرزیدہ وجود میں حرکت ہوئی اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اشفا کو سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی تایا ابا کے مہربان سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''اشفا! تم نے آنے میں کیوں اتنی دیر کر دی؟'' ان کے کانپتے ہاتھ اس کا سر تھپتھپا رہے تھے۔

''کیوں چلی گئی تھیں تم بغیر بتائے۔ تمہیں ہماری محبتیں بھی نہ روک سکیں' شازم کے وجود نے بھی تمہارے قدموں کو زنجیر نہ کیا اور مرتضیٰ......'' تایا ابا کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔ اس کا سر اور ماتھا چومتے ہوئے وہ بہت رنجیدہ تھے۔

''اور مرتضیٰ۔'' اشفا نے کچھ خوفزدہ سے انداز میں ان کے سینے سے سر اٹھایا۔

''مرتضیٰ تمہارے منہ پر تھوکے گا بھی نہیں۔''

مہوش سامنے کھڑی تمسخرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو کہ تایا ابا کے بازو کے حلقے میں لڑکھڑاتے ہوئے بمشکل اپنے وجود کو گھسیٹ رہی تھی۔

☆☆☆

''لکی! ایک بیڈ نیوز سنو۔'' وہ پھولی سانسوں سمیت تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی۔ لکی جو کہ اپنے ہی دھیان میں مگن سیٹی پر کوئی دھن گنگناتے ہوئے موسم انجوائے کر رہا تھا ایک دم ہی ٹھٹک کر رکا۔

''بیڈ نیوز......'' لکی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے ہونٹ سکیڑے اور پھر بولا۔

''بیڈ نیوز نہیں' گڈ نیوز بولو۔ آنٹی ڈیزی کی ڈیتھ میرے لئے ایک اچھی خبر ہے جسے میں بار بار سننا چاہوں گا۔'' لکی نے لاپرواہی سے اپنی اکلوتی خالہ کے متعلق کمنٹس پاس کئے' جنہیں مرے ہوئے ابھی آٹھ

"ہم ..." اشفا نے دانت پیسے۔

"وہ تو میں ہوں ہی، تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی خوبیوں کے بارے میں پتا ہے۔" وہ ہنوز اسی ... ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا تو اشفا جھنجھلا سی گئی۔

"میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتی ہوں۔"

"وہ، ناکہ آنٹی ڈیزی کی تمام پراپرٹی اب میری ہے۔ وہ مرنے سے پہلے تمام جائیداد میرے نام کر گئی ہیں"

"واٹ... آنٹی نے پراپرٹی تمہارے حوالے کر دی، امپاسبل۔" اشفا کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آنٹی اپنے اس بھانجے سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔

"ہاں آنٹی نے جاتے جاتے مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔" لکی مسکرایا اور پھر مزید بولا۔

"اب تم کون سی بیڈ نیوز بتانا چاہ رہی ہو۔"

"ہاں دراصل پاپا اور ماما پاکستان جا رہے ہیں۔"

"تو اچھی بات ہے۔"

"ہاں اچھی بات ہے، ماما مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ رہی ہیں۔" اشفا کو اب اس کے انداز پر غصہ آنے لگا تھا

"ابھی چلی جاؤ ان کے ساتھ پاکستان، گھوم پھر آؤ۔ میں بھی کچھ عرصے تک ورلڈ ٹور پر نکل جاؤں گا۔ آخر ... ہوا ہوں، سیر و تفریح میرا حق ہے۔" اشفا نے اب کچھ حیرانی سے لکی کی طرف دیکھا تھا، جس کے تیور ... بدلے سے لگ رہے تھے۔ نئی نئی دولت کا خمار تھا۔

"میری خواہش تو تھی کہ تم بھی میرے ساتھ جاتیں مگر خیر، میں تمہارا پروگرام کیوں خراب کروں۔ تمہاری ماما ... بھی مجھے پسند نہیں کرتیں۔" اشفا جان گئی تھی کہ اب وہ صرف دامن بچانے کیلئے بہانے کر رہا ہے۔ جب اسے جاب کی ضرورت تھی تب وہ پاپا کے ہوٹل میں ڈش واشنگ کیلئے بھی تیار تھا اور یہ اشفا ہی تھی جس نے پاپا کو ... منا کر اسے قدرے بہتر جاب دلائی۔ اشفا کو ایک دم ہی اس سے گھن محسوس ہوئی تھی۔

"تھرڈ کلاس پاکستانی۔" اشفا نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ آنٹی ڈیزی کی مہربانی سے لکی کو گرین کارڈ تو مل ہی چکا تھا ... وہ کسی نیشنلٹی ہولڈر...... لڑکی کی تلاش میں تھا تاکہ تمام پیپرز کلیئر کروا سکے۔ اشفا اس لحاظ سے اسے کافی ... تھی کیونکہ نا صرف وہ بے حد حسین تھی بلکہ بہت دولت مند بھی تھی مگر مسئلہ اس کے ماں باپ کا تھا جو کہ اس ... نگاہ رکھتے تھے۔

"اچھا اشفا، مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ پھر ملیں گے۔" سامنے سے آتی ٹیکسی کو روک کر وہ جھپاک سے ... بیٹھا اور یہ جا وہ جا۔

''اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔'' اشفا نے تنفر سے کہا اور سر جھٹکتی اپنے گھر کی طرف آ گئی۔ داخلی دروازے پر ماما کوڑے کی باسکٹ لئے کھڑی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر لجاجت سے بولیں۔

''ٹینا آج آئی نہیں اور میں سیڑھیاں اتر نہیں سکتی۔ یہ باسکٹ کا کوڑا ڈرم میں الٹ آؤ۔'' اشفا نے بغیر بحث کیئے باسکٹ پکڑ لی۔ ڈرم کے قریب آ کر اس نے ڈھکن اٹھایا اور گویا لکی کی نام نہاد دوستی کو بھی اسی ڈرم میں دفنا کر چلی آئی۔

اس نے لکی پر بہت احسانات کیئے تھے۔ جب اس کی آنٹی نے لکی کو گھر سے نکال دیا تب وہ اس مجبور بے کس پاکستانی کو گھر لے آئی۔ پاپا کی منت سماجت کر کے جاب دلوائی۔ تین چار ماہ تک اس کے تمام اخراجات اس نے اپنے ذمے لے لئے۔ اسے لکی پر ترس آ گیا تھا۔ جب وہ اسی کوڑے کے ڈرم کے پاس رکھے سرخ بینچ پر لیٹا با آواز بلند اپنی قسمت کو روتے ہوئے کوس رہا تھا۔

لکی نے اپنی مجبوریوں کی ایسی داستان سنائی کہ اشفا کا دل پسیج گیا۔ وہ لکی میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس سے ہمدردی کر رہی تھی مگر ماما نہ جانے کیا سمجھیں۔ انہوں نے لکی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ انہیں یہ خوف تھا کہ ان کی سر پھری بیٹی کہیں اس نکمے لڑکے سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کرے۔ مگر جب اشفا کو ماما کے اس فعل کے متعلق پتا چلا تو محض ماما کی ضد میں اس نے لکی کے ساتھ رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ماما کی روک ٹوک سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ جس کام سے اسے منع کرتیں' دانستہ یا نادانستہ اشفا سے وہ غلطی سے سرزد ہو جاتی تھی۔

اس کی ماما بے حد بھولی بھالی سیدھی سی گھریلو خاتون تھیں مگر تھیں تو اس کی ماں۔ ہر وقت اس پر نظر ہوتی تھی ان کی' اشفا کہاں جا رہی ہے۔ کہاں سے آ رہی ہے۔ یونیورسٹی میں کون کون سے فرینڈ ہیں۔ انہیں مکمل خبر ہوتی۔

یونیورسٹی میں اشفا کا کوئی دوست نہیں یہ خبر ان کیلئے باعث اطمینان تھی۔ اشفا کا مزاج ایسا تھا کہ کوئی خود سے اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کب اس لکی منحوس پر اس کی نظر پڑی تھی اور وہ اس پر ترس کھا کر اسے گھر لے آئی۔ ماما نے جب اسے گھر سے نکالا تو وہ لکی کی وجہ سے ماما سے لڑ پڑی۔ ان کے سمجھانے بجھانے کا الٹا اثر ہوا اور اس نے لکی کو ہوٹل میں جاب دلوا دی۔ اپنی گاڑی بھی اسے استعمال کیلئے دے دیتی تھی۔

وہ کوڑے کی خالی باسکٹ دروازے کے پاس رکھ کر اندر جانے کی بجائے جلتی بھنتی اپنی دوست مرینہ کے گھر چلی آئی۔

''بہت دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔'' مرینہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا جواباً جو مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

''کافی غصے میں لگ رہی ہو؟'' اشفا کو ہونٹ چباتے اور سرخ چہرہ لئے دیکھ کر مرینہ نے کہا تو وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

''تم ٹھیک کہتی تھیں مرینہ! یہ سب پاکستانی لالچی اور خودغرض ہوتے ہیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' مرینہ پریشانی سے بولی۔

''وہ لکی کمینہ اوقات دکھا گیا ہے۔'' اشفا اسی غصے کے عالم میں پھنکاری۔ ''میں تو اس کے بدلے تیور دیکھ کر شاک میں تھی۔ اتنا خیال ہی نہیں آیا کہ اپنی وہ رقم جو میں نے بطور قرض اسے دی تھی وہی مانگ لیتی۔ وہ رقم معمولی نہیں تھی کہ میں اسے بخش دیتی۔''

''تو اب مانگ لو۔'' مرینہ نے نرمی سے کہا۔

''وہ تو دفعان ہو گیا ہے۔'' اشفا نے دانت پیسے۔

''کہاں......'' مرینہ بھی چونک اٹھی تھی۔

''نہ جانے کہاں' مجھے ایک بات کا تو پکا یقین ہے کہ آنٹی ڈیزی نے اپنی پراپرٹی دلی خوشی سے ہرگز لکی کو نہیں دی ہوگی۔ اس چالباز نے یقیناً بڑی چالاکی سے آنٹی سے پیپرز پر سائن کروائے ہوں گے۔''

''اس بات کا امکان ہے۔'' مرینہ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

''بہت ہی کمینہ اور ذلیل نکلا ہے احسان فراموش بالکل یاسر کی طرح۔'' اشفا کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ مرینہ کے چہرے پر اک سایہ سا لہرایا۔

''تم نے بھی تو اس خبیث پر احسان کیا' اسے امریکہ بلوایا' شادی کی اور پھر وہ بھی اپنی اوقات دکھا گیا۔''

مرینہ کا چہرہ زردی مائل ہو گیا تھا۔ اسے بہت سال پہلے کے کچھ منظر یاد آنے لگے تھے۔ جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ لاہور اپنی پھوپھی کے پاس گئی تھی۔

وہ خوب صورت نہیں تھی۔ اس بات کا اسے خود بھی علم تھا۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی مگر پھوپھی اور ان کی فیملی نے تو ایسے اس کا استقبال کیا گویا وہ کسی ریاست کی شہزادی ہے۔ ان کی بیٹیاں اس کی تعریفیں کر کر کے نہیں تھکتی تھیں اور خود یاسر' اس نے تو گویا مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی اور نہ جانے کیوں مرینہ سب کچھ جانتے بوجھتے اس کی باتوں کے سحر میں جکڑی گئی۔ اس حقیقت کا تو اسے بہت بعد میں ادراک ہوا تھا کہ یہ شادی صرف اور صرف یاسر نے اپنا مستقبل بنانے کی خاطر کی تھی۔ جب اس نے اپنے قدم جما لئے تو بہت سے اپنے ہی ہم مزاج مادہ پرست اور سطحی ذہنیت کے پاکستانیوں کی طرح وہ بھی مرینہ کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسانے دوسرے شہر چلا گیا تھا۔

''سوری مرینہ! میں نے تمہیں دکھی کر دیا'' اپنی جھونک میں بولتی اشفا کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ بہت غلط بول رہی ہے۔

''کوئی بات نہیں۔'' مرینہ رنجیدگی سے مسکرائی۔

''جی تو چاہ رہا ہے کہ اس لکی کمینے کو شوٹ کر دوں۔'' ایک مرتبہ پھر اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

''یوں کرو' پولیس کو انفارم کر دو۔

''مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا مگر......'' اشفا نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

''مگر کیا......''

''پاپا سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ جتنی بھی غصیلی، نک چڑھی اور ضدی تھی مگر ماں باپ کے سامنے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ خصوصاً پاپا سے اسے بہت خوف آتا تھا۔

''ایک بات پوچھوں اشفا! غصہ تو نہیں کرو گی۔''

مرینہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو، بولو کیا پوچھنا ہے۔''

''کیا تم لکی میں انٹرسٹڈ ہو۔''

''اوف...... تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ میں تو صرف اس سے ہمدردی کر رہی تھی مگر ماما سمیت نہ جانے سب کیا سمجھے۔'' اشفا نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ مرینہ کو پشیمانی ہوئی۔

''آئم سوری......''

''اٹس اوکے......'' وہ ہولے سے مسکرائی اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆☆☆

رات بھر مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی۔ اس موسم کے نیویارک میں بسنے والے پاکستانی امریکن شہری اب عادی ہو چکے تھے۔

اشفا کسلمندی سے کمبل ہٹا کر اٹھی اور پھر گلاس ونڈو سے بھاری کرٹن ہٹا کر نیچے رواں دواں زندگی کا جائزہ لینے لگی۔ اسی پل اس کی نگاہ آنٹی ڈیزی کے مکان کی طرف اٹھی تھی۔ گیٹ کے پاس پولیس کھڑی تھی۔ اشفا کو حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر اس کے ذہن میں سے کچھ روشن ہوا۔ وہ پولیس کو مایوس پلٹتا دیکھ کر تاسف سے سر ہلانے لگی تھی۔

''گھاگ شکاری بھاگ گیا ہے۔''

''مگر پولیس کے شکنجے سے تم بھی نہیں بچو گے۔ اسے اپنے ملک کی پولیس مت سمجھنا۔'' وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر باہر آئی تو ماما اور پاپا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی جلدی اٹھنے کا نئے سرے سے عہد کر کے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''کیا لو گی اشفا۔'' ماما نے کافی کا مگ پاپا کی طرف بڑھاتے ہوئے جمائیاں لیتی اشفا سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے سستی سے کہا۔

''کیا مطلب، یہ بوائل ایگ اور دودھ کا گلاس پیو۔'' ماما نے کرسٹل کی ٹرے میں مختصر ناشتہ اس کے سامنے رکھا۔

''جب کرنی ہمیشہ اپنی مرضی ہوتی ہے تو پھر پوچھتی کیوں ہیں؟'' اشفا نے بے دلی سے دودھ کا گلاس

اٹھا لیا۔ ماما اب پاپا سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اشفا کو جواب دینا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔
''سیٹیں کب کنفرم ہوں گی۔'' ماما کے لہجے میں بے تابی تھی۔ اشفا چونک اٹھی۔
''تیاری تو مکمل ہے بس ایک دو ضروری کام نبٹا لوں انشاء اللہ پندرہ بیس دن بعد ہم پاکستان میں ہوں گے۔

''میں نے بھی کچھ شاپنگ تو کر لی ہے ور باقی اشفا کو ساتھ لے جاؤں گی اور عروبہ' مہوش کیلئے یہ اپنی پسند سے شاپنگ کر لے گی۔ نمرہ اور ثانیہ نے تو اپنی پسند بتا دی ہے مجھے۔ نجمہ کی بچیوں کیلئے بھی کپڑے خرید لئے ہیں۔'' ماما بڑے جوش کے عالم میں پاپا کو تفصیلات فراہم کر رہی تھیں۔ پاپا بھی بہت دلچسپی سے سن رہے تھے۔ اشفا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔
''اپنے گھر' اپنے وطن کی بات ہی کچھ اور ہے۔''
''اونہہ......'' اشفا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔
''آپ نے بھائی جان سے بات کی۔'' ماما کا لب و لہجہ حد سے زیادہ دھیما ہو چکا تھا۔ اشفا نے لاپرواہی سے ٹی وی پر نگاہیں جما دیں۔
''ہوں۔'' پاپا نے آہستگی سے ہکارا بھرا اور بولے۔
''وہ سب تو ہمارے آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ بھابھی نے تو ابھی سے تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔ بس جاتے ہی چھوٹی سی رسم کے بعد نکاح کر دیں گے۔'' انہوں نے تمام تفصیلات سے بیوی کو آگاہ کیا تو وہ ایک دم ہی مطمئن اور سرشار ہو گئیں۔ اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے حوالے سے وہ حد پریشان تھیں۔
پاپا کے جانے کے بعد وہ کچن سمیٹ کر اشفا کے پاس آ بیٹھی تھیں۔ اشفا نے چونک کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔
''تم بھی آہستہ آہستہ اپنی پیکنگ مکمل کر لو۔''
''کیوں؟''
''ہم عنقریب پاکستان جانے والے ہیں۔'' عطیہ بیگم نے نرمی سے جواب دیا۔
''صرف آپ اور پاپا' میں نہیں جاؤں گی۔''
''تم یہاں اکیلی رہو گی۔ تمہارے پاپا ہرگز نہیں مانیں گے۔'' انہوں نے اپنے ازلی نرم لہجے میں کہا تو وہ تنک اٹھی۔
''آخر پہلے بھی تو پاپا پاکستان اکیلے جاتے رہے ہیں۔''
''مجھے سولہ سال ہو گئے ہیں اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے ملے ہوئے۔ تمہاری وجہ سے ہمیشہ میں اپنے دل کو مار لیتی تھی۔ پہلے اسکول' کالج پھر یونیورسٹی' تمہاری پڑھائی کا حرج نہ ہو جائے یہی سوچ مجھے روک دیتی' مگر اب کوئی رکاوٹ نہیں اور تمہیں بھی دادی سے ملے اتنے ہی سال ہو گئے ہیں۔ تم سے ملنے کیلئے بہت بے تاب

ہیں۔ خوامخواہ بدمزگی نہ پھیلاؤ ہونا وہی ہے جو تمہارے پاپا چاہتے ہیں۔ اچھی بیٹیوں کی طرح اپنی تیاری مکمل کرو اور فرمانبرداری سے والدین کی بات مانتی جاؤ۔ ماں باپ بچوں کیلئے کبھی بھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔'' وہ چند لفظوں میں نہ جانے کون کون سے مفہوم واضح کر کے اٹھ گئی تھیں جبکہ اشفا غصے سے تنتناتی رہ گئی۔

اتوار کے روز وہ ماما کی بنائی لسٹ کے مطابق شاپنگ کر کے آئی تو ماما کو فون پر مصروف پایا۔ یقیناً پاکستان سے فون آیا تھا اور اب کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل باتیں ہونا تھیں۔ ماما عادتاً تمام خاندان کی خیریت تفصیلاً دریافت کرتی تھیں اور جتنے تفصیل کے ساتھ ماما کے سوال ہوتے تھے اسی حساب سے مکمل معلومات دینے والے بھی بھرپور فرصت سے چیدہ چیدہ واقعات ماما کے گوش گزار کرتے۔

جوں ہی ان کی نگاہ اشفا پر پڑی تو انہوں نے دوسری طرف شخصیت کو ہولڈ کرنے کا کہہ کر اسے آواز دے کر بلایا۔ مرتا کیا نہ کرتا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی ماما کے برابر رکھے صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

''دادی سے بات کرلو۔'' انہوں نے زبردستی اس کے کان سے ریسیو لگایا۔ دوسری طرف دادی کی محبت سے لبریز آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے اک طویل سانس خارج کر کے ان کے متوقع سوالوں کیلئے خود کو تیار کرلیا۔

''میری بچی کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ لب و لہجے کی بے زاری چھپا نہیں پائی تھی۔

''میں تو ہر گھڑی تم لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں۔ برسوں بیت گئے تمہاری اور عطیہ کی صورت دیکھے ہوئے۔ ہارون تو تقریباً ہر سال ہی آتا ہے مگر تم.....'' ہر دفعہ فون پر ان سے اسی قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ اشفا کی بے زاری دو چند ہوگئی۔

''میں نے تمہارے لئے بہت شاندار کپڑے بنوائے ہیں۔ ایک ایک جوڑا بہت قیمتی اور نفیس ہے اور زیورات بھی بہت خوبصورت ہیں۔'' اشفا غائب دماغی سے جی جی کر رہی تھی۔ ماما نے غصے سے بھناتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریسیو پکڑ لیا۔ اشفا جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

اسی شام ہسپتال سے فون آیا کہ مرینہ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اشفا پریشانی کے عالم میں ماما کو مختصر بتا کر ہسپتال چلی آئی۔

اگرچہ مرینہ کو چوٹیں اتنی شدید نہیں آئی تھیں مگر وہ ذہنی طور پر بے حد نڈھال تھی۔ تنہائی کے احساس نے اس بتیس سالہ عورت کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ اشفا کی مسلسل دل جوئی اور تیمارداری نے اگرچہ اسے کافی سنبھالا دیا تھا مگر پھر بھی اک کمی تھی جو کہ دل و روح کو مسلسل چاٹ رہی تھی۔

اشفا نے ایک دن مرینہ سے چوری ڈائری میں سے یاسر کا نمبر لے کر اسے فون کر ڈالا۔ فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ یہ نمبر اس کی فیکٹری کا تھا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ اشفا نے مرینہ کا ایکسیڈنٹ اور اس کی ذہنی حالت کے متعلق اتنے دلسوز انداز میں بتایا تھا مگر پھر بھی اس سنگدل انسان پر قطعاً اثر نہ ہوا۔ پہلے پہل وہ نرمی

سے بات کرتی رہی تھی مگر یاسر کی بدزبانی جب بڑھی تو اس کا بھی پارہ چڑھ گیا۔

''وہ تمہاری بیوی ہے اور اسے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔''

''وہ میری بیوی اب نہیں ہے۔شاید اس نے تمہیں نہیں بتایا میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔''

دوسری طرف یاسر نے قدرے تحمل سے کہا تو اشفا چلا اٹھی۔

''جھوٹ مت بولو' اپنی ذمے داریوں سے جان چھڑوانے کیلئے بہانے مت بناؤ بے غیرت انسان۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا اس کے ساتھ اب کوئی تعلق نہیں۔'' یاسر نے بھی ناگواری سے کہا۔

''وہ تمہاری کزن تو ہے۔اس رشتے سے تو انکار نہیں کرو گے۔''

''اونہہ کزن۔'' یاسر تنفر سے بولا۔

''بہت کمینے انسان ہو تم۔ پہلے اسی رشتے کا سہارا لے کر تم نے فراڈ کے ساتھ مرینہ سے شادی کی۔ گرین کارڈ اور امریکہ کی روشنیوں نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔میری دعا ہے کہ تمہاری بینائی کبھی واپس نہ آئے اور تم اسی طرح اندھیروں میں رہو۔'' اشفا نے دو چار موٹی گالیاں دے کر فون رکھ دیا تھا۔

اس کے دل میں وہ نفرت جو کہ بہت آہستہ آہستہ پنپ رہی تھی ایک دم جڑیں پکڑ کر تناور درخت بن گئی۔اس کے سامنے تصویر کے جو رخ آئے تھے وہ بہت بھیانک تھے اس نے ان منفی پہلوؤں کو اپنے دل اور ذہن پر نہ مٹانے کیلئے نقش کر لیا تھا۔

مرینہ کی صحت اب قدرے بہتر تھی مگر اشفا روزانہ ہی اس کے فلیٹ میں آ جاتی۔اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔تقریباً بیس پچیس دن بعد مرینہ بھی کام پر جانے لگی تھی۔ابھی وہ مرینہ کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو پائی تھی کہ اچانک ماما کی طبیعت بگڑ گئی۔

ماما کی بیماری کے دوران اسے احساس ہوا تھا کہ ماما نے اسے اور پاپا کو کس طرح سنبھال رکھا تھا۔ان کی غیر موجودگی میں پورے گھر کا نظام الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی۔

ماما کی صحت بحال ہوئی تو انہوں نے پاکستان جانے کی رٹ لگا دی۔ پاپا' ماما کی صحت کی وجہ سے جلدی جلدی کام سمیٹ رہے تھے۔اشفا نے ماما کی ضد کی وجہ سے ایک دم ہی جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس نے چپکے چپکے اپنے تئیں کوششیں جاری رکھیں۔ایک ماہ کے اندر اندر اسے ایک اچھی کمپنی سے جاب کی آفر ہوئی تو اس نے جوائن کرنے میں اک پل کی بھی دیر نہ کی۔ ماما کو اگرچہ بہت اعتراض تھا مگر پاپا نے نہ جانے کیا کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا کہ پھر دوبارہ انہوں نے اس کی جاب کے متعلق کوئی بات نہ کی۔

اشفا کی روٹین کافی ٹف تھی۔صبح صبح آنکھ کھلنے میں اتنی دیر لگ جاتی اور پھر تیاری بھی نامکمل سی ہوتی' وہ اتنی آرام طلب تھی اور اب کہاں اسے اتنی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔صرف اور صرف پاکستان جانے سے بچنے کیلئے یہ جاب کا تکلیف دہ ڈھول اسے گلے میں لٹکانا پڑا تھا۔

صبح ہمیشہ وہ دیر سے آفس پہنچتی تھی۔آج بھی گاڑی نے راستے میں کافی خوار کیا اور جب وہ دفتر پہنچی

تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ آفس کے اصول کے مطابق میٹنگ روم میں اب اس کا داخلہ ممنوع تھا لہٰذا وہ متوقع بے عزتی سے بچنے کی خاطر اپنے کیبن میں آ کر بیٹھ گئی۔

میٹنگ تقریباً تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ اس دوران اشفا کا سیروں خون خوامخواہ جلتا رہا۔ میٹنگ کے اختتام پر لنچ شروع ہو گیا اور اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر باس نے اسے آفس بلا کر بے بھاؤ کی سنائیں۔ جب وہ آفس سے نکلی تو منہ سوجا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں اس گنجے جاپانی باس کو گالیوں سے نوازتے وہ پارکنگ میں آئی تو گاڑی کو غائب پایا۔

''ہیں...... یہ گاڑی کہاں گئی۔'' اس نے فکر مندی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ وہ گاڑی کی چابی نکالنا تو جلدی میں بھول گئی تھی لہٰذا وہ کسی چور اچکے یا پھر ایڈونچر کے شوقین مزاج انگریزوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ پولیس کو بتانے کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ اب تک وہ لوگ گاڑی کے ٹائر وغیرہ اور قیمتی پارٹس اتار کر کسی سنسان سڑک پر چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔ اشفا نے تھک ہار کر ٹیکسی کو اشارہ کیا اور پھر جلتی بھنتی گھر چلی آئی۔ ماما کو گاڑی کا بتا کر شامت بلوانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

دوسرے دن اس نے تیاری کے دوران پاپا کو کہتے سنا۔

''کل بارہ بجے کی فلائٹ ہے ہماری' تم اشفا کو بھی بتا دو۔''

''اشفا کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کی بھی پیکنگ کر دی ہے۔'' ماما نے لاپرواہی سے کہا تو اشفا سلگتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گئی۔

''ماما! میں پاکستان کیسے جا سکتی ہوں۔ نئی نئی جاب ہے' چھٹی بھی ملنا مشکل ہے جبکہ......''

''ہمیں آپ کی اس نام نہاد جاب سے کوئی غرض نہیں۔ آپ کی ماما کی صحت ٹھیک نہیں' لہٰذا آپ خوامخواہ انہیں ٹینشن نہ دیں۔'' پاپا نے نرمی سے اس کی گفتگو کو منقطع کر کے کہا تو وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

''مگر پاپا......''

''نو اگر' مگر۔'' وہ مسکراتے ہوئے بریف کیس اٹھائے باہر نکل گئے۔

''ماما! میرا جانا کیا بہت ضروری ہے؟''

''اشفا......'' انہوں نے خفگی سے اسے گھورا تو وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گی۔ اس کا موڈ بری طرح آف تھا۔ کوئی بھی بہانہ کامیاب نہیں رہا تھا۔ وہ رات بھر سے لے کر پاکستان آنے تک ماما' پاپا سے خفا خفا رہی۔

ایئر پورٹ پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیونکہ پاپا نے انہیں آج کے دن آنے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر لاہور میں موجود اپنے ماموں کے گھر ٹھہرے رہے اور پھر وہ اور پاپا اکیلے گاؤں جانے کیلئے تیار ہو گئے کیونکہ ماما کو ماموں نے بضد اصرار روک لیا تھا۔

گاؤں پہنچنے تک بھی اس کا موڈ بگڑا رہا ہے۔ اپنے کزنز سے مل کر اسے قطعاً کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان سب کی محبت کے جواب میں اس کا رویہ خاصا سرد رہا تھا۔ جسے شاید سب اس کی جھجک محسوس کر رہے تھے۔

اس کے دادا حیات حسین کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

سب سے بڑے تایا ابو تھے۔ ان کا ایک بیٹا مرتضیٰ اور دو بیٹیاں نمرہ اور ثانیہ تھیں۔ رابعہ تائی ان کی دوسری بیوی تھیں انہی سے ان کی دو بیٹیاں تھیں جبکہ مرتضیٰ ان کی پہلی بیوی سے تھا جو کہ اس کی پیدائش پر وفات پا گئی تھیں۔

پھر نجمہ پھوپھو تھیں جو کہ بیوگی کے بعد اپنے والد کے گھر میں ہی اپنے چار بچوں ثمن' سائرہ' عاشر اور عامر کے ہمراہ مقیم تھیں۔ ان کے بعد ان کے پاپا ہارون حیات تھے۔ اشفا ان کی اکلوتی بیٹی تھی جو کہ ان کی شادی کے تقریباً سات سال بعد پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس کے بعد دو مزید بھائی بھی ہوئے مگر وہ کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔

سب سے چھوٹے مرسلین چچا تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ نقی اور تقی اور دو ہی بیٹیاں تھیں۔ مہوش اور عروبہ۔ مہوش سب سے بڑی تھی۔ انتہائی مغرور اور نک چڑھی سی یہ کزن تو اشفا کو سرے سے ہی پسند نہیں آئی تھی۔
ان کی آمد کے ساتھ ہی گھر میں اک عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ دادی اپنے جوڑوں کے درد کو بھلائے ملازموں کو مختلف ہدایات دے رہی تھیں۔ گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے دن ماما بھی خوب لدی پھندی سی چلی آئیں۔ سارا دن عجیب سی بھگدڑ مچی رہی۔ اسے ماما سے تنہائی میں بات کرنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ وہ جب بھی ان کے قریب جاتی کوئی نہ کوئی انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔
ثمن اور سائرہ سے اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ لیکن آج کے دن تو وہ بھی کافی مصروف تھیں۔ اشفا غصے کے اظہار کے طور پر اپنے کمرے میں جا گھسی۔ اسی پل ماما کو بھی گویا فرصت مل گئی تھی اس کے پاس آنے کی۔ ماما نے آتے ہی والہانہ انداز میں اسے ساتھ لپٹا کر ماتھا چوما۔ نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میری بیٹی خفا خفا سی لگ رہی ہے۔'' ان کی آواز بھی قدرے بھرائی سی تھی۔ اشفا چونک سی گئی۔

''آپ کو میری خفگی کی پروا ہے؟''

''اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو بیٹا! کیا والدین اولاد کیلئے کبھی غلط سوچ سکتے ہیں۔'' ماما نے نرمی سے اس کے الجھے بال سمیٹے۔ اشفا ایک مرتبہ پھر چونک سی گئی۔

''ماما! آپ واضح لفظوں میں بات کیوں نہیں کرتیں۔ یہ مبہم گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

وہ ماما اور پاپا کے انداز دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس بھی کچھ انوکھا ہو جانے کا پیغام دے کر اسے الرٹ کر رہی تھی۔

''ابھی کچھ دیر بعد تمہارا اور مرتضیٰ کا نکاح ہے۔''

''کیا......'' اشفا چلا اٹھی تھی۔

''آہستہ......'' ماما نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر بے یقینی کے عالم میں انہیں

دیکھتی رہ گئی۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتیں ماما۔آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔''

''ابھی کچھ دیر بعد مولوی صاحب تمہاری رضا مندی معلوم کرنے کیلئے آنے والے ہیں۔ اسی لئے تمہیں بتایا ہے۔خوامخواہ شور مت کرو۔ ہونا وہ ہی ہے جو میں اور تمہارے پاپا چاہیں گے۔'' انہوں نے ازلی نرم لہجے میں کہہ کر گفتگو کو سمیٹا تو اشفا حیرت' دکھ' صدمے کی وجہ سے گنگ ہی رہ گئی تھی۔

''ماما! میں آپ کی بیٹی ہوں۔کوئی گائے بھینس نہیں کہ جس کھونٹے سے باندھا بندھ گئی۔آپ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں۔''

''تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو اشفا! ہماری امیدوں' تمناؤں کا واحد مرکز' یہ خواب' یہ خواہش میری ہی نہیں تمہارے باپ کی بھی ہے' اس خواب کا تعلق تمہارے تایا اور دادی سے بھی ہے۔کیا تم ہماری محبتوں' چاہتوں کا صلہ یہ دو گی۔کیا تم بھری برادری کے سامنے اپنے باپ کے سر کو جھکا دو گی۔کیا تم ان سب کے ان خدشات پر مہر لگاؤ گی۔کیا تم اپنے عمل سے یہ ثابت کر کے دکھاؤ گی کہ یورپ میں پلنے والی ساری اولادیں اسی طرح نافرمان' ضدی اور بدلحاظ ہوتی ہیں۔کیا تم میری تربیت کا مذاق بناؤ گی۔اگر ایسا کچھ ہوا تو اللہ کی قسم تم اپنی ماں کا چہرہ عمر بھر نہ دیکھ سکو گی۔اتنی ذلت کے بعد میں جی کر کروں گی بھی کیا۔لوگ تھوکیں گے مجھ پر کہ یہ تربیت کی ہے میں نے اپنی اکلوتی اولاد کی۔مجھ سے ایک بچی کی پرورش بھی نہ ہو سکی۔'' عطیہ کی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ان کی آواز رندھ چکی تھی۔شاید مزید بولنے کی ان میں سکت نہیں رہی تھی۔

اسی پل دروازہ کھلا اور پاپا دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے اندر آئے۔ان کے پیچھے تایا ابو اور دو اور بھی بزرگ آدمی تھے۔اشفا کو لگا کہ پھانسی کا پھندا اس کی گردن کے قریب کسا جا رہا ہے۔اسے سولی پر چڑھانے کیلئے لوگ آ چکے تھے۔

اس کے اندر نفرتوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔یہ ڈرامہ بہت خوش اسلوبی سے کھیلا گیا تھا۔اسے بے وقوف بنا کر سب ہی ہنسی خوشی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔اس نے باپ کے چہرے کی طرف دیکھنا چاہا تو آنسوؤں کی دھند نے ہر منظر دھندلا دیا۔اس کی جی چاہ رہا تھا وہ ابھی اٹھے اور چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔یہ شادی سراسر فراڈ ہے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے سگے ماں' باپ اس کے ساتھ ایسا کریں گے۔پہلے اسے ان لوگوں کی چاہتوں اور جھوٹی محبتوں کا بہلاوا دے کر پاکستان لائے اور پھر زبردستی اپنے پینڈو' اجڈ بھتیجے کے ساتھ اپنی اتنی لائق اور قابل بیٹی کا نکاح کر دیا۔ماما کی طرح پاپا نے بھی جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لے کر اس کی زبان پر زبردستی تالا لگانا چاہا۔یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اشفا کی تمام سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔حتیٰ کہ اسے تو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف آنسو بہانا بھی یاد نہیں رہا تھا۔وہ ٹکر ٹکر ان کی صورتیں دیکھتی رہی۔احتجاج اور بغاوت کے متعلق ذہن نشین تمام باتیں اس کا منہ چڑاتی رہیں

''اگر میں امریکہ میں ہوتی تب بھی یہ لوگ میرے ساتھ ایسا کرتے؟'' اس نے حیرت و بے یقینی سے خود سے سوال کیا۔

''ابھی تو مجھے یہاں آئے دو دن بھی نہیں ہوئے اور ماما نے کتنی چالاکی سے تمام ڈرامہ رچالیا ہے۔ اب کتنی خوش اور مطمئن لگ رہی ہیں۔ دنیا کی ساری مائیں کیا ایسی ہوتی ہیں۔ ظالم اور روڈ۔'' اس نے اذیت سے لب کچلے تو نچلے ہونٹ سے خون کی بوند ٹپک پڑی۔

''کیا میں اب اپنی ساری زندگی اس پرانے طرز پر بنے کھنڈر مکان میں روتے' تڑپتے گزار دوں گی۔'' اشفا کا دل اک پل کیلئے اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا تو وہ بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں، کبھی نہیں۔''

''ایک کھیل ان لوگوں نے میرے ساتھ کھیلا ہے اور ایک کھیل میں ان لوگوں کے ساتھ کھیلوں گی۔'' اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''شطرنج کی بساط تو ان لوگوں نے بچھائی ہے۔ مہرے بھی اپنی مرضی سے رکھ لئے۔ اب گیم کے اختتام کا انتظار کریں۔ ہار جیت کا فیصلہ تو ابھی ہونا باقی ہے۔'' وہ سرخ آنکھیں لئے بڑے بے خوفی کے عالم میں سوچ رہی تھی۔

''میں اب تمام عمر ان جاہلوں کے ساتھ رہوں' جو بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لے کر عالم فاضل بن کر بیٹھ گئے ہیں اونہہ.....'' اشفا نے غصہ سے اپنے بال نوچے۔

''ماما! میرا معیار کیا اتنا گھٹیا تھا جو آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر ماں سے متنفر ہو کر سوچ رہی تھی۔

''آپ کیسی ماں تھیں کہ بیٹی کی خواہش کا آپ کو پتا نہیں چل سکا۔ کیا میں نے ایسی زندگی کی تمنا کی تھی۔'' پہلی مرتبہ ایک سرکش آنسو آنکھ کے کنارے سے پھسل پڑا تھا۔

''میں نے اپنی زندگی کا اختیار آپ کو دیا تھا آپ نے اسے بڑے ناجائز انداز میں استعمال کر ڈالا ہے۔ کیا میں نے ایسے آدمی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جو دن بھر زمینوں پر ٹریکٹر چلائے' میرا آئیڈیل یہ ہے کیا۔ ایک انتھک محنت کرنے والا کسان۔'' اس کا پورا وجود زہر زہر ہو رہا تھا۔

''میں ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزاروں جو اچھے مستقبل کا لالچ لئے روشنیوں کی دنیا میں جانے کا خواہشمند ہو۔'' اس کے سامنے مرینہ کی ویران آنکھیں اور بے رنگ زندگی کے مناظر لہرائے۔

''ان لوگوں کے جو خواب ہیں وہ تو میں کبھی بھی پورے نہیں ہونے دوں گی۔'' اشفا نے اک عزم سے سوچا۔

''ابھی تو پاپا نے ماما کی بیماری کا ڈراوا دے کر زبردستی کر لی ہے مگر آئندہ زندگی میں میں کسی کو اپنے اوپر اختیار نہیں دوں گی اور وہ دبو سا مرتضٰی' بھلا اس کی کیا جرأت ہے۔ میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی اگر اس

نے مجھے چھوا۔''

اسے پاکستان آئے ابھی بیالیس گھنٹے نہیں ہوئے تھے اور تمام عرصے میں اس نے صرف ایک مرتبہ گاؤں کی کچی پکی سڑک پر پسینے سے شرابور میر مرتضٰی کو دیکھا تھا اور اس وقت وہ اسی مرتضٰی کے متعلق اندازے لگائے بڑے بڑے پلان سوچ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ کوئی لکی جیسا کمزور اور ڈرپوک بندہ نہی اور نہ ہی یاسر جیسا بزدل ہے جو اشفا کی گالیوں کے جواب میں بھی من من کرتا رہے گا۔ وہ لکی نہیں تھا جو سہاروں کی تلاش میں نیویارک کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔

وہ یاسر بھی نہیں تھا جو گرین کارڈ کے لالچ میں ایک لڑکی نہیں بلکہ کئی لڑکیوں کے جذبات واحساسات سے کھیلتا رہا تھا۔

وہ تو محمد میر مرتضٰی حیدر تھا جس کے قدموں کی **دھمک** سے زمین لرز اٹھتی تھی۔ وہ اپنے بابا میر حیات حیدر کا ولی عہد اور قریب قریب کے تمام گوٹھوں کے بسنے والوں کے دلوں پر راج کرنے والا میر مرتضٰی تھا۔

اس گاؤں میں نہ کوئی چوہدری تھا نہ رعایا۔ سب انسان برابر تھے۔ سب کسان محنتی تھے' سب زمیندار جرأت مند تھے۔

میر مرتضٰی میں اور اس کے مزارے دین محمد میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ فرق میر نے اس بھادوں کی سہانی شام کو منا ڈالا تھا جب اس کے بابا نے اس کے سر پر اپنی دستار رکھ دی تھی۔ اسے اس دستار کا بھرم رکھنا تھا۔

اس نے پشت ہاپشت سے قائم دائم بہت ہی پرانی فرسودہ روایات کو توڑ ڈالا۔ اس نے گاؤں میں اسکول کی بنیاد رکھی۔

اس نے نہری پانی کو انصاف کے ساتھ زمینداروں اور مزارعوں کے مختصر رقبوں میں دنوں کے حساب سے تقسیم کر کے اس بے انصافی کو منایا۔

اس نے چھوٹے زمینداروں کو اپنے بل بوتے پر ٹیوب ویل لگوا دیئے۔

یہ وہ میر مرتضٰی تھا جب زمینوں کے دورے پر کبھی دوسرے گوٹھ جاتا تو لوگ اس کا استقبال اتنا شاندار کرتے گویا وہ کسی ریاست کا شہنشاہ ہے۔

اور مائی میراں تو کہتی تھی کہ میر واقعی ہماری ریاست کا شہنشاہ ہے۔ میر جب بھی گوٹھ جاتا۔ مائی میراں کی جھگی میں چند لمحوں کیلئے ضرور ٹھہرتا اور پھر مائی میراں اپنے اپنا پسندیدہ گیت سناتی۔ اگرچہ وہ بوڑھی ہو چلی تھی مگر اس کی آواز میں جوانی جیسی تازگی اور رس تھا۔ اتنی رسیلی آواز شاید ہی کسی کی ہو۔

اے راجہ حسن دا ' صدا راج مانے
کدی پھیرا پاول ' غریباں دے ڈیرے

مائی خاص اس کیلئے میٹھے پانی کی تازہ مچھلی منگواتی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی اور گھی میں تلنے کے بعد نمک لگا کر اس کے سامنے پیش کرتی۔

اور اس وقت مکرم جان کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑتیں جب مرتضٰی بہت شوق سے مچھلی کو ابلے چاولوں کے ساتھ تناول کرتا۔ کیا مکرم جان جانتا نہیں تھا کہ میر مرتضٰی کو مچھلی کی بو کتنی ناپسند ہے۔

مائی میراں ایک مرتبہ پھر سرائیکی زبان میں پنجابی کا اپنا پسندیدہ گیت گنگناتی۔

ہے راجہ حسن ' صدا راج مانے

کدی پھیرا پاول ' غریباں دے ڈیرے

وہ سوچوں میں گم ابھی تک گم سم سی بیٹھی تھی جب سائرہ' ثمن اور نمرہ بھاری پیکٹ اٹھا کے ہنستی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''وڈیری ماں (تائی امی) نے آرڈر دیا ہے کہ ان کی اکلوتی حسین وجمیل بہو یہ شاندار نفیس لباس فاخرہ زیب تن فرمائیں اور اس کے بعد ملک کی نامور بیوٹیشن ثمن آپ کی نوک پلک سنواریں گی کیونکہ نیچے رسم کیلئے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔'' ثانیہ نے میک اپ کا سامان بیڈ پر پھیلایا اور نمرہ اس کے کپڑے نکالنے لگی۔ اشفا غائب دماغی سے اس تمام کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔

''پہلے تم چینج کر آؤ۔'' ثمن نے اشفا سے کہا تو وہ سنبھلتے ہوئے چیخ کر بولی۔

''میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گی۔''

''ارے اشفا ڈیئر! ہمارے یہاں دلہنیں ایسے ہی کپڑے اپنی شادی کے موقع پر زیب تن کرتی ہیں۔'' سائرہ نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ فوراً ہی سمجھانے والے انداز میں بولی تو اس کے چہرے پر ناگواری پھیلتی چلی گئی۔

''مجھے تیار نہیں ہونا اور نہ ہی میں ایسے کپڑے پہنوں گی۔''

''تمہیں یقیناً یہ بھاری لہنگا دیکھ کر الجھن ہو رہی ہے مگر فکر نہیں کرو' رسم کے بعد اتار دینا۔ لیکن فی الحال تو تمہیں یہ کپڑے پہننا ہوں گے۔ کیونکہ دلہن لہنگا نہ پہنے تو وہ دلہن نہیں لگتی۔''

نمرہ نرمی سے مسکرائی تو اشفا ان کی فضول بک بک سن کر جھنجلا گئی۔ اسی پل عطیہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ انہیں صورت حال سمجھنے کیلئے بس کچھ پل ہی لگے تھے۔ انہوں نے بچیوں کو نرمی سے مختلف کاموں کیلئے چند منٹوں کیلئے باہر بھیجا اور پھر اشفا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بس اتنا ہوا تھا کہ جب نمرہ' ثانیہ لوگ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں تو اشفا روئی روئی آنکھیں لئے لہنگا پہنے بیٹھی تھی اور عطیہ چاچی کمرے میں پھیلی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے نمرہ کو اشارہ کیا۔ ثمن نے آگے بڑھ کر اشفا کا میک اپ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب تک وہ تیار کرتی رہی تھی عطیہ ان کے قریب بیٹھی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہیں۔ میک اپ کے بعد اشفا کے سر پر دوپٹہ سیٹ کیا گیا اور اس کے بعد عاشر کیمرہ اٹھائے اندر چلا آیا۔ ایک اور ناقابل برداشت کام۔

عامر کسی ماہر فوٹو گرافر کی طرح ہدایات دے رہا تھا اور عاشر تصویریں اتار رہا تھا۔ ''بھابھی! یوں کریں' ایسے کھڑی ہوں۔ ویسے کھڑی ہوں۔'' اشفا کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر عطیہ نے عاشر کو منع کیا کہ اس وقت کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

پھر جب نمرہ' ثانیہ اسے تھام کر نیچے لائیں تو اتنے لوگوں کے بیچ میں مرکز نگاہ بن کر بیٹھنا اور بھی دشوار ہو گیا۔ تائی امی اسے آتا دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھیں' پھوپھو نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔ تائی امی نے اس کے سر سے ڈھیروں پیسے لگا کر خیرات کئے' محبت سے پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیں۔

''میری دھی رانی تو رج رج کے سوہنی ہے۔'' وہ بڑے فخر کے عالم میں سب کو بتا رہی تھیں۔ لوگوں کی حسد اور رسک سے بھری نگاہیں اشفا کا طواف کر رہی تھیں۔

اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کسی اور کی رتجگے کی سرخی لئے لہو رنگ نگاہیں بھی اس کے گرد چکرا رہی ہیں۔

اشفا اس بات سے بے خبر تھی کہ کسی اور کا دل اس پل لہولہو ہو رہا ہے۔ کسی اور کے دل کی سرزمین اجڑ رہی ہے۔ دل کے شہر میں تلاطم برپا ہے۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ خواب کا محل گر رہا ہے اور امنگیں دم توڑ چکی ہیں۔

اشفا اپنے ہی غم کو سینے سے لگاتے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے کسی اور کی خبر بھی کیا ہوتی۔ اس پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ احتجاج کرتی بھی تو کیا یہ ظلم کرنے والا کوئی اور نہیں تھا بلکہ اس کے اپنے والدین تھے۔

اپنے خود ساختہ غم میں نڈھال اسے پتا نہ چلا کہ کب مہوش اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ چونکی تو تب جب مہوش کی دھیمی غراتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کسی اور کی جاگیر پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تم نے۔ مرتضیٰ کو پکے کاغذوں میں اپنے نام کر لیا ہے۔ تیری سیدھی سادی بھولی ماں تو بڑی چالباز نکلی۔'' اشفا غائب دماغی سے اسے سن رہی تھی۔ اس کی توجہ دوسری طرف مبذول ہو رہی تھی جہاں سے شور کی اور اک ساتھ عورتیں اور لڑکیوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''مرتضیٰ لالا آ رہے ہیں۔'' نمرہ کے چہکنے کی آواز آئی۔

''مرتضیٰ کا دل تو میر جاگیر تھا اور میں اپنی جاگیر کسی اور کے حوالے نہیں کروں گی۔'' وہ چنگھاڑتے ہوئے اٹھی اور پھر تیزی سے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

نہ جانے اور کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں۔ اشفا تو سن سی بیٹھی رہی گویا پتھر کا مجسمہ ہے۔

اسٹیج پر پاپا اور تایا ابو کے ساتھ مرتضیٰ بھی آیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اسے وہاں سے اٹھایا گیا۔ پاپا اور تایا ابو نے اسے ڈھیروں پیار کیا۔ تائی امی اور دادی نم آنکھوں سے اسے دعائیں دیتی رہیں۔ بس ثمینہ چاچی اور مہوش کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ مرسلین چاچو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں روپے تھمائے۔

نمرہ' ثانیہ جس طرح تھام کر اسے باہر لے کر آئی تھیں اسی طرح تائی امی کے کہنے پر دوبارہ تھامے ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں چھوڑ گئیں۔

اشفا نے زندگی میں آج سے پہلے کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ شادی میں کیا کیا رسومات ہوتی ہیں اور اپنے خاندان کے رواجوں کے متعلق تو وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ اس کے پاپا کے کزن کی دو

شادی شدہ بیٹیاں اور حرا اور افشاں اس کی تنہائی کا احساس کر کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ اشفا تھک گئی ہے۔" افشاں نے خیال ظاہر کیا تھا۔ اشفا کو ان دونوں کی موجودگی اور بولنا سخت برا لگ رہا تھا مگر فی الحال وہ انہیں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

"اشفا نے اپنے خاندان کی بھلا کہاں کوئی شادی اٹینڈ کی ہے۔ اسے کیا پتا ہمارے رواج کا؟" حرا بڑی شرارتی نظروں سے اس کے دل میں اتر جانے والے روپ کو دیکھ کر بولی تو افشاں بھی کھلکھلا اٹھی۔ اشفا کا مارے کوفت کے...... برا حال ہو گیا۔

"اشفا! اگر تم چاہو تو کپڑے بدل لو۔" اشفا کو خود بھی عجوبہ بن کر بیٹھنا سخت برا لگ رہا تھا۔ مگر وہ ان دونوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش تھی۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اپنے اس حسین روپ کو نوچ گھسوٹ دے اور اس کمرے کی سجی سجائی چیزوں کو تہس نہس کر دے۔ یہ کمرہ یقیناً مرتضیٰ کا تھا۔ اس نے پورا گھر بھی دیکھا ہی کہاں تھا کہ اسے سب کے کمروں کے متعلق اندازہ ہوتا۔

"تم یقیناً مرتضیٰ کا انتظار کر رہی ہو مگر یار! کیا ہے کہ ہماری خاندانی رسم کے مطابق مرتضیٰ آج رات ادھر نہیں آئے گا لہٰذا تم اطمینان رکھو۔" حرا نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"چلو آج کی رات تو جان بخشی ہو گئی ورنہ شوہر کو بھگتنا کوئی آسان ہے۔" افشاں نے راز داری سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اشفا کو ان کا ہنسی ٹھٹھول زہر لگ رہا تھا۔

"تم شکر کرو یار! کہ تمہاری ساس بہت اچھی ہیں ورنہ شوہروں کے ساتھ ساتھ خطرناک ساسوں سے نبٹنا بہت مشکل ہے۔"

"تو اور کیا رات بھر میاں کو بھگتو' ان کا جی بہلاؤ اور دن بھر سسرالیوں کے نخرے برداشت کرو۔" افشاں نے ایک اور کھنکتا قہقہہ لگایا۔

"ویسے تم خوش نصیب ہو اشفا! کہ تمہیں مرتضیٰ جیسے شخص کا ساتھ ملا ہے۔ اس جیسا تو کوئی ہے ہی نہیں ' اگر مجھے ابھی بھی مرتضیٰ کی طرف سے شادی کی آفر ہوتی تو میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ لگاتی۔" حرا انتہائی دلسوزی سے بولی تھی۔ انداز میں بھرپور شرارت تھی۔ وہ دونوں بہنیں بہت زندہ دل تھیں مگر اشفا کو ان کی زندہ دلی اور خوش مزاجی بہت چبھ رہی تھی۔

"یہ خاتون مرتضیٰ سے پورے نو سال بڑی ہیں۔" افشاں نے راز داری سے اشفا کے قریب جھک کر کہا تو حرا بلبلا اٹھی۔

"تم نے ایک سال زیادہ کر دیا ہے۔ میں صرف آٹھ سال بڑی ہوں مرتضیٰ سے۔"

"صرف آٹھ سال۔" افشاں آنکھیں پھیلائیں۔

"آٹھ سال کا فرق اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔" حرا ڈھٹائی سے بولی تھی۔ اسی پل اس کا تین سالہ بیٹا بھاگتا ہوا آیا تو وہ اپنے بیٹے کو چومنے لگی تھی۔

''ویسے یار! مجھے تو مرتضٰی بچارے پر ترس آ رہا ہے۔ آخر اس کا حق ہے کہ وہ اپنی خوب صورت بیوی کا جی بھر کر دیدار کرے۔'' افشاں نے تاسف سے سر ہلایا تو حرا نے بھی بھرپور تائید کی۔

''میرا خیال ہے کہ اس وقت ایک ملاقات کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' حرا پرسوچ انداز میں بولی۔

''تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو' اگر ملاقات طویل ہوگئی تو ہماری تمہاری پیشی لگ سکتی ہے۔'' افشاں نے مسکراتے ہوئے حرا کے خیال کو رد کیا تو وہ بھی تائید میں سر ہلانے لگی۔

''اس نقطے پر تو میں نے غور نہیں کیا۔''

''تم کسی بھی نقطے پر غور نہیں کر رہیں۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ دلہنیا کچھ بے زاری سی ہو رہی ہے لہٰذا اپنے اس لاڈلے کو اٹھاؤ جو کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اپنی ممانی کو دیکھ رہا ہے بلکہ گھور رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں نیند بھی بھری ہے۔'' افشاں نے بھانجے کو اک پیار بھری چپت لگا کر حرا سے کہا تو اسے بھی اشفا کی تھکاوٹ کا ایک دم احساس ہوا۔ لہٰذا وہ دونوں اسے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئیں تو اشفا نے اک طویل پرسکون سانس خارج کی۔ ان دونوں کی اس طویل گفتگو میں جو بات اشفا کو پسند آئی تھی بلکہ اس کے دل کو لگی تھی۔ وہ مرتضٰی کے نہ آنے کی خوشخبری تھی۔ اس کے کندھوں سے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کیلئے ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھی۔

''تھینک گاڈ۔'' اس نے کپڑے بدلنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ اس قدر تھکن ہو رہی تھی کہ بس جیولری کو اتارنے کی ہمت کر سکی۔ مگر جوں ہی بستر پر لیٹی تو اک نامعلوم سی بے چینی نے گھیراؤ کر لیا۔

''میں اور مرتضٰی ...... اف' میں نے کبھی ایسا سوچا نہیں۔ تم کبھی مجھے نہیں پا سکو گے مرتضٰی۔ تم میرا آئیڈیل نہیں۔ میری اور تمہاری سوچیں مختلف ہیں' میرے اور تمہارے راستے مختلف ہیں' منزلیں مختلف ہیں مگر پھر ان بزرگوں نے ایسا کیونکر کیا۔ پاپا میں آپ سے ناراض ہوں' میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی اور یہ مرتضٰی آج نہیں تو کل ضرور اس کمرے میں آئے گا۔ وہ مجھے چھونے کی کوشش کرے گا' حق جتائے گا اور میں اسے واضح لفظوں میں بتا دوں گی کہ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں اور یہ کہ میں اسے قطعاً پسند نہیں کرتی بلکہ اس رشتے کے بعد تو مجھے اس سے شدید نفرت ہوگئی ہے۔ وہ اسی قابل ہے کہ اس کی شادی اسی خاندان کی کسی لڑکی کے ساتھ ہوتی۔

میں اسے بتا دوں گی کہ ماما نے مجھے اپنے آنسوؤں اور بیماری کی بلیک میلنگ سے اس سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ کہ وہ اب میری مجبوری کا مزید فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ میں اسے اتنا ذلیل اور شرمندہ کروں گی کہ وہ میرے ساتھ نگاہ اٹھا کر بات نہیں کر سکے گا۔ اس پینڈو جاہل کو بھلا بات کرنے کا سلیقہ ہی کہاں ہوگا۔ زرعی یونیورسٹی سے ایم اے کر کے اس نے بڑا تیر مار لیا ہے۔ گھٹیا انسان۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے مجھ جیسی لڑکی خوش قسمتی سے مل جائے گی۔''

اور بھی نہ جانے کون کون سی منفی سوچوں نے اس کے ذہن کو آلودہ کر رکھا تھا۔ نہ جانے کب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگی۔ اس کا ذہن اسی وقت بیدار ہوا جب ہلکے سے کھٹکے کی آواز آئی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر اٹھ

بیٹھی۔ مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھول کر اس نے اپنے سامنے دیکھا تو حیرت سے ایک جھٹکا سا لگا۔

صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے سفید لباس اور سفید ہی پگڑی نما صافے کو سر اور گردن سے سندھی انداز میں لپیٹے وہ پوری آنکھیں کھولے مسکرا رہا تھا۔ نہیں وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ اشفا کو غلط فہمی سی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر قدرے جھجکتے ہوئے دیکھا وہ یک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں' نہ جانے یہ کیسی آنکھیں تھیں۔ اتنی عجیب اور سحر زدہ کر دینے والی آنکھیں' نہیں بلکہ خوف زدہ کر دینے والی آنکھیں' بے حد روشن چمکیلی اور گہری سیاہ مقناطیسی کشش لئے لحہ بہ لحہ مسکراتی آنکھیں۔

یہ وہ مرتضیٰ حیدر نہیں تھا جسے اس نے پرسوں کڑکتی دوپہر میں ڈیرے کی کچی پکی سڑک پر دیکھا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی مرتضیٰ حیدر تھا۔ آنکھوں میں غرور کی چمک لئے' تفاخر سے بیٹھا اس کے پل پل بدلتے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا انہی گہری لحہ بہ لحہ مسکراتی آنکھوں سے۔

اس نے ان آنکھوں کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ وہ ایک انگریز غیر شہرت یافتہ غریب سا مصنف تھا جس کا خوش قسمتی سے ایک ناول کتابی شکل میں آ گیا تھا۔ اس ناول کے عنوان کا صفحہ بھی پھٹ چکا تھا۔ یہ ناول اسے آنٹی ڈیزی کے اسٹور سے بڑی خستہ حالت میں ملا تھا۔

اس ناول میں روم کے کسی شہزادے کا ذکر تھا۔ ناول میں شہزادے کے حسن کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ خصوصاً اس کی آنکھوں کی...... ان آنکھوں میں بھی دنیا کو سکندر اعظم کی طرح فتح کر لینے کی چمک تھی مگر وہ روم کا شہزادہ محبت میں ناکام ہو گیا تھا اور اس ناکامی نے اس کے دل کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ڈرتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔ مرتضیٰ کی آنکھوں میں بھی کچھ انوکھی سی چمک تھی۔ اگرچہ اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

''مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا ہے کیا؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''ہرگز نہیں۔'' اشفا نے یقین سے سوچا۔

''تو یقیناً یہ اس کی شخصیت کا رعب ہے؟'' ایک اور سوالیہ نشان ذہن میں روشن ہوا تو وہ چپ سی رہ گئی۔

''مجھے سر تا پا دیکھ کر اگر تسلی کر لی ہے تو کچھ کہوں......'' انداز اجازت لینے والا نہیں تھا نہ ہی طنز بھرا تھا مگر اشفا کو یوں محسوس ہوا کہ وہ ایسے بہت کچھ جتا گیا ہے۔

''تم میرے اس کمرے میں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھیں یقیناً۔'' اس کا انداز ناقابل فہم تھا۔

''مگر افسوس میں نے ہمیشہ دوسروں کی توقعات کے خلاف کام کیا ہے۔'' اس نے دوسروں کہہ کر ایک مرتبہ پھر اسے جتایا تھا۔

''تمہارے نزدیک یہ شادی بہت آناً فاناً ہوئی ہے مگر یہاں سب لوگ پچھلے تین چار مہینوں سے تیاریاں کر رہے تھے۔'' اشفا کے اعصاب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ وہ یوں بول رہا تھا گویا روٹین کی باتیں ہوں۔ شاید اسی لئے اشفا کے بھی ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم ایک

مرتبہ پھر یاد آ گئے ساتھ ہی تنفر کی ایک تیز لہر من میں اٹھی۔
''میرے نزدیک اس رشتے کی سرے سے نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی میں نے اس شادی کو تسلیم کیا ہے۔''
''تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے نکاح نامے پر دستخط کر دئے یہی بہت ہے۔ مسئلہ تو تب بنتا جب تم انکار کر دتیں اور پھر مجھے گن پوائنٹ پر تم سے سائن کروانے پڑتے۔ اپنی عزت اور انا کا سودا میں کسی حال میں بھی نہیں کرتا۔'' اس کا لب ولہجہ کافی سخت تھا اور آواز دھیمی۔
''میں انکار بھی کر سکتی تھی۔'' اشفا ایک دم پھنکاری۔
''پھر کیا کیوں نہیں۔'' وہ ہی سخت لہجہ اور دھیمی آواز۔
''ماما اور پاپا کی وجہ سے' مگر تم مجھے بزدل یا ڈرپوک مت سمجھنا۔ میں صرف اور صرف مجبور ہو گئی تھی۔''
''بزدل' ڈرپوک۔'' مرتضیٰ ابھی تک سامنے لگی پینٹنگ کو ہی بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر مصنوعی حیرانی سے دہرانے لگا۔
''اچھا' تو تم بہت بہادر ہو۔''
''مجھے تم سے' تمہارے اس گھر سے شدید نفرت ہے۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں۔'' اشفا ایک مرتبہ پھر چلائی۔ وہ اسی طرح چلا چلا کر مرتضیٰ پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ اسے قطعاً پسند نہیں کرتی اور یہ کہ وہ اپنی حدود میں رہے۔
''اس نفرت کی کوئی خاص وجہ۔'' وہ گویا اس کی ہر بات کا مذاق اڑا رہا تھا۔ انداز بھی کافی پرسوچ تھا۔ اشفا آگ بگولا ہو گئی۔
''تم میرا آئیڈیل نہیں ہو۔''
''تمہارا آئیڈیل کیا ہے؟''
''وہ میں تمہیں کیوں بتاؤں؟'' اس نے بھرپور تنفر سے غصیلے لہجے میں کہا تو مرتضیٰ نے نگاہوں کا زاویہ بدلا۔
''اتنا اونچا مت بولو کہ مجھے بھی جواباً آواز بلند کرنی پڑے۔''
''بولوں گی' ضرور بولوں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ اتنی غیرت ہوتی تو اتنا سب کچھ سننے کے بعد اس کمرے سے اٹھ کر چلے جاتے مگر تم جیسے......''
''بس......'' وہ اس قدر بلند آواز میں بولا تھا کہ اشفا کا دل لرز کر رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو اشفا نے خود کو داد دینی چاہی۔
''مجھے ایسا پہلے ہی بول دینا چاہئے تھا۔'' اشفا نے مسرت بھرے انداز میں سوچا۔ مرتضیٰ تیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ جان بوجھ کر لاپروا بن گئی۔ وہ باہر نہیں گیا تھا بلکہ کمرے میں دو تین قدم چل کر رکا۔ شاید اپنے غصے کو کنٹرول کر رہا تھا۔ لیکن یہ اشفا کی خام خیالی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے جیب میں سے موبائل

نکال کر کسی مکرم جان سے بات کی۔ موبائل آف کر کے اس نے صوفے پر پھینکا اور بولا۔

''عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں بلکہ مردانگی کی توہین ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب آیا۔ اس کی نگاہیں اس کے سراپے پر تھیں۔ اشفا نے پلکیں اٹھا کر دیکھا اور پھر دیکھتی رہی گئی۔ وہ ہی ساکت کر دینے والی سیاہ آنکھیں' نہ جانے اس کی آنکھیں اتنے رنگ کیوں بدلتی تھیں۔

''جو مرد عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ وہ میری ڈکشنری میں بزدل مرد ہوتے ہیں۔ اس کمزور مخلوق جو آپ کے رحم و کرم پر ہے اور صرف زبان ہی چلا سکتی ہے اس پر ہاتھ اٹھانا کہاں کی بہادری ہے۔'' اب وہ اس کے قریب بیٹھ چکا تھا۔ اشفا دم بخود سی رہ گئی۔

''میں تمہیں صرف زبان سے سمجھانا چاہتا ہوں اور تم بھی اچھی بیویوں کی طرح صرف زبان کی بات سمجھنا۔'' مرتضٰی نے بہت سہولت سے اس کا سادہ بغیر مہندی لگا دودھیاں گداز ہاتھ پکڑ کر بغور دیکھا اور بولا۔

''جو کچھ ابھی کہہ چکی ہو اسے میں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تمہاری زبان پر یہ الفاظ نہ ہوں۔'' وہ دھیمی آواز اور رعب دار لہجہ۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' وہ انتہائی بدتمیز سے بولی تھی۔

''آئندہ تم کبھی اس انداز میں بات بھی نہیں کرو گی۔'' اس نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ تھاما اور بایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے گویا اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اشفا کا دل خوف سے کانپ اٹھا تھا۔

''میں اپنی باتیں بار بار دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔''

اشفا نے اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں۔ وہ پیچھے ہٹنا چاہ رہی تھی مگر صرف پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

☆☆☆

دیکھو مجھے چھونا نہیں' ہاتھ نہیں لگانا مجھے پلیز چھوڑو۔'' بے ربط سے چند جملے اس کے سرخ لبوں سے آزاد ہوئے تو اک مضبوط ہاتھ نے اس کے لبوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا۔ خوف اور اس کے ہاتھ کی سختی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں انسو آ گئے تھے اور تمام دعوے بھی دھرے کے دھرے رہ گئے۔

''ڈیئر اشفا! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو احمقوں کی طرح اپنے حق سے زبردستی نگاہ چرا لیتے ہیں۔ محض تم جیسی سرکش عورتوں کی وجہ سے تم مجھے بہت مختلف پاؤ گی۔ میں دوسروں کے حقوق کی جنگ لڑنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں تو اپنے اس جائز اور حسین حق سے کیسے دستبردار ہو جاؤں۔ تم خوب صورت ہو اور تمہارا شوہر ہونے کے ناتے میں تمہیں ضرور سراہوں گا۔'' وہ اشفا کے خوب صورت نقوش کی نرماہٹوں کو محسوس کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا تو اشفا دبی دبی آواز میں چیخی۔

''تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔''

''میں نے کہا نا کہ اپنے لب و لہجے پر کنٹرول کرو ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔'' مرتضٰی نے اس

کے خوبصورت بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

''وحشی، بے ہودہ، جنگلی انسان۔''

''کچھ اور بھی کہہ دو۔'' وہ اس کی شدتوں سے گھبرا کر ایک دم ہی گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی تھی۔

صبح وہ کمرے میں تنہا تھی اور مرتضیٰ نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی تمام جیولری سامنے رکھے ٹیبل پر پڑی تھی۔ وہ اٹھی تو ایک دم ہی گردن سے ٹیس سی اٹھی۔ دونوں کلائیوں میں موجود چوڑیاں غائب تھیں اور کلائیوں میں بھی چبھن ہو رہی تھی۔ وہ واش روم سے باہر آئی تو ایک مرتبہ پھر رات کے مناظر آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ایک دفعہ پھر دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔

''اس نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی۔'' اپنے ہی کہے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ تمسخر اڑا رہے تھے۔

''بہت برے ہو مرتضیٰ تم، بہت گھٹیا اور کمینے۔'' اس نے غصے کے عالم میں اپنے بال نوچ ڈالے۔ اسی پل دروازے پر دستک ہوئی اور ماما کی آواز بھی سنائی دی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماما کے ساتھ خوب لڑے جھگڑے مگر نہ جانے کیوں انہیں سامنے پا کر اس کے لبوں پر قفل لگ گئے تھے۔

نمرہ اور ثانیہ اس کیلئے ناشتہ لے آئی تھیں۔ تائی امی اور دادی اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔ اسے ان سب کی محبتیں دھوکہ اور دکھاوا محسوس ہو رہی تھیں۔

''اگر یہ میرے اپنے ہوتے تو میری خواہشات کا احترام کرتے۔'' وہ اپنی سوچوں میں الجھی تھی جب ثمینہ چاچی کمرے میں داخل ہوئیں۔ تائی امی اور ثمینہ چاچی سگی بہنیں بھی تھیں۔ اسی لئے وہ تائی امی کو بھابھی کی بجائے آپا کہتی تھیں۔ چاچی نے جب تائی امی کی توجہ اشفا کے روکھے آرزدہ انداز کی طرف مبذول کروائی تو اشفا بھی ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔

''کیا یہ لوگ میرے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھ رہے ہیں۔'' اسے ایک دم سبکی کا احساس ہوا تھا۔ تبھی چاچی تنہائی پاتے ہی اس کے قریب آ بیٹھیں۔

''زبردستی کے رشتے بھی کبھی پائیدار ہوتے ہیں۔ بھائی جان اور ہارون بھائی کو تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مجھے تو حیرت عطیہ بھابھی کے رویے پر ہے انہیں تو کم از کم ماں ہونے کے ناتے تمہارا ساتھ دینا چاہئے تھا۔ مگر وہ تو خود ہی......'' انہوں نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس کی سوچوں کو ایک نیا رخ دے کر وہ خود تو اٹھ گئیں جب کہ اشفا تھک ہار کے تکیے میں سر دیئے بے سدھ ہو گئی۔

☆☆☆

''ماما! آپ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔''

''اشفا! کیا بچپنا ہے یہ۔ سب لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں اور انہیں ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ تمہاری یہ خوش قسمتی ہے کہ تم اپنے اصل گھر میں اپنوں کے درمیان رہو گی اور پھر مجھے مرتضیٰ کی طرف سے

بھی کافی اطمینان ہے۔ وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔ جانا تو ضروری ہے نا۔''

''بڑا خیال رکھتا ہے وہ تو مجھے پتا ہے کہ......'' وہ ماما کے سمجھانے پر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

''ماما! آپ مجھے ان جنگلی لوگوں میں چھوڑ کر جا رہی ہیں۔''

''اشفا! کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' عطیہ نے خفگی سے اسے گھورا اور پھر نرمی سے بولیں۔

''دیکھو بیٹا! اب تم شادی شدہ ہو چکی ہو۔ اپنے شوہر اور اس گھر میں دل لگاؤ۔ اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ میری بیٹی کو شاد آباد کرے اور جلد ہی تمہاری گود بھر جائے۔ اگلی دفعہ جب میں آؤں تو اپنی بیٹی کو اتنا مصروف پاؤں کہ میرے لبوں پر یہ شکایت رہے کہ اشفا ہمیں وقت نہیں دے رہی۔'' انہوں نے اس کی پیشانی کو چوم کر گلے سے لگایا۔

''اپنی ماما اور پاپا کے متعلق جو بدگمانیاں ہیں انہیں ختم کر دو بیٹا صرف یہی سوچ کر کہ ماں باپ اولاد کا صرف بھلا ہی چاہتے ہیں۔'' اشفا کو اگر پتا ہوتا کہ یہ اس کی ماں کا آخری پیار ہے اس کیلئے تو وہ کبھی ماما کو جانے ہی نہ دیتی پاپا کو روک لیتی۔ مگر انسان اپنے رب کے فیصلوں کے سامنے بے بس ہے۔

ایک دم اتنا بڑا صدمہ' اتنا بڑا غم...... والدین کی دائمی جدائی' وہ بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ والدین کا سایہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔

اسلام آباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ صرف چند گھنٹوں میں ہی زندگی کا تعلق ٹوٹ گیا۔ وہ ان کے بے جان جسموں سے لپٹ لپٹ کر کس قدر روئی تھی۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کرنے کی کیوں جلدی تھی۔ وہ اسے مضبوط سائبان دے کر خود مطمئن ہو گئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کر گئے تھے۔ انہیں بہت جلدی تھی اپنے آخری سفر پر جانے کی۔ انہیں بہت جلدی تھی کہ اشفا اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ زمانے کے بے رحم تھپیڑے ان کی نازک سی بیٹی کو توڑ پھوڑ نہ دیں۔

مرتضیٰ' نمرہ' ثانیہ سب کی دلجوئی بھی اس کے اس عظیم صدمے کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ دادی اپنے بیٹے کی میت کو دیکھ کر بالکل ہی نڈھال ہو گئی تھیں۔ تایا ابو کے کندھے جھک گئے تھے۔ وہ سب غمزدہ تھے مگر اشفا کو اپنا غم سب سے بھاری لگتا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے تھے ایک وہ ہی تھی جسے کسی پل سکون میسر نہیں تھا۔

عاشر یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرنے لگا تھا۔ عامر ابھی تک زیر تعلیم تھا اور پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں مقیم تھا۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں یہ دونوں بھائی گھر آتے تو خوب ہی رونق سی ہو جاتی۔

دادی اشفا کو بھی کمرے سے باہر لے آتیں۔ ان کے جانے کے بعد پھر ہر طرف سکوت سا طاری ہو جاتا۔ مہوش اور عروبہ کبھی اپنے پورشن سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ثمن' سائرہ اور نمرہ ثانیہ ہمہ وقت اس کی دلجوئی کیلئے تیار رہتیں۔ گھر میں اگر یہ لڑکیاں نہ ہوتیں تو بالکل ہی اس گھر میں الو بولتے۔ مرتضیٰ اکثر ڈیرے پر ہی رہتا

تھا کبھی کبھار جب ضرورت محسوس ہوتی تو گھر آتا۔ یہ اس کی روٹین تھی اور اسے بدلنا بہت مشکل تھا۔

تائی امی اور دادی کے بہت مرتبہ کہنے پر بھی اس نے اپنی روٹین نہیں بدلی تھی۔ وہ ہی بے رنگ سے شب و روز تھے اور وہ ہی اشفا کی سب سے اوّل روز کی طرح بے زاری۔ مرتضٰی کی خوش مزاجی اسی طرح قائم دائم تھی اور اشفا کی بے زاریت عروج پر۔ بس اتنا فرق تھا کہ وہ اب مرتضٰی کے سامنے تڑتڑ نہیں بولتی تھی۔ اوّل روز کا جو اک رعب و دبدبہ سا اس کے دل پر طاری ہوگیا تھا ابھی تک قائم تھا۔

ہفتے کے روز مرتضٰی کی گھر میں موجودگی سب کیلئے باعث حیرت تھی۔ اس روز عجیب بات یہ ہوئی کہ مہوش بھی اپنے پورشن سے تشریف لے آئی۔ اشفا کی توجہ بھی نمرہ نے اس طرف دلائی تھی۔

''آج لالا دن کے وقت گھر میں ہیں تو یہ محترمہ بھی اپنے بل سے باہر نکل آئی ہیں۔'' ثانیہ اور سائرہ کچن میں مصروف تھیں۔ بہت ہی مزے دار پکوانوں کی خوشبو اشفا کو بھی کچن میں کھینچ لائی تھی۔

''یہ کس کیلئے اتنا خاص اہتمام ہو رہا ہے؟'' اشفا نے لاپرواہی سے ایک گرما گرم کباب اٹھاتے ہوئے پوچھا تو نمرہ فوراً بولی۔

''آج آپ کے شوہر نامدار ہمارے ساتھ کھانا کھانے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں اسی سلسلے میں تیاریاں عروج پر ہیں۔''

''بھابھو! لالہ تمہیں بلا رہے ہیں۔'' ثمن نے کچن میں جھانک کر اشفا سے کہا اور کباب اٹھا کر بھاگ گئی۔ ثانیہ ارے ارے ہی کرتی رہ گئی تھی۔ اشفا کا حلق کڑوا سا ہوگیا۔ وہ ادھ کھایا کباب پلیٹ میں رکھ کر بے دلی سے اوپر آ گئی۔

''آپ نے بلایا ہے۔'' انداز لٹھ مارنے والا تھا۔ مرتضٰی جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔ اشفا اس کے مسلسل دیکھنے پر جھنجھلا سی گئی تھی۔

''کوئی کام تھا مجھ سے۔''

''ضروری تو نہیں کہ بیوی کو کام کے سلسلے میں ہی بلایا جائے۔''

''آپ تو ہمیشہ کام کے سلسلے میں ہی آواز دیتے ہیں یا پھر مطلب.....'' اشفا نے ایک دم ہی زبان دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ مقابل کی آنکھیں اس پل کیسے جگمگ کر رہی تھیں۔ اشفا نے آج تک اسے مسکراتے نہیں دیکھا تھا کیونکہ یہ کام اس کی آنکھیں بخوبی سرانجام دے دیتی تھیں۔

''یعنی کہ تم کہنا چاہتی ہو کہ میں بہت مطلبی ہوں۔'' وہ لفظوں کو پکڑنے کے فن سے آشنا تھا اشفا تو کہہ کر پچھتائی۔

''میں جاؤں۔''

''میں نے تمہیں جانے کی ابھی اجازت نہیں دی۔ یہاں بیٹھو۔'' اشفا مرے مرے قدم اٹھاتی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔

''اگر تمہیں تین چار چیزوں میں اختیار دے دیا جائے تو تم کس چیز کا انتخاب کرو گی۔ دولت' رشتے' آزادی یا پھر محبت۔''

''یہ کیسا سوال ہے۔'' وہ الجھی۔

''یہ بہت اہم سوال ہے۔''

''میں آزادی کا انتخاب کروں گی۔'' اشفا نے جھٹ سے کہا۔

''وجہ۔''

''کیونکہ دولت تو میرے پاس پہلے سے موجود ہے اور......'' وہ سوچنے لگی تو مرتضٰی آہستگی سے بولا۔

''اور رشتوں اور محبت کی تمہیں ضرورت نہیں لہٰذا آزادی تمہارا انتخاب ہو گی اور وہ بھی مجھ سے۔''

''آپ عقلمند ہیں۔'' اس نے کافی کھلے دل سے سراہا تو مرتضٰی نے کہا۔

''تم بے عقل' احمق اور بے وقوف ہو۔'' اشفا کا منہ بن گیا تھا اور غصہ بھی شدید آیا مگر پی گئی۔ زیادہ بولنے کا خمیازہ وہ بھگت چکی تھی۔

''چھوڑو ان باتوں کو میرا سر دباؤ۔ جب بھی پاس بیٹھتی ہو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔'' اشفا اس نئے حکم پر جی بھر کے تلملائی تھی۔

''گلا نہ دبا دوں۔'' اس نے تنفر سے سوچا۔

''زور سے دباؤ.....'' مرتضٰی نے اس کے ہاتھ کو سختی سے مروڑا تو وہ چلا اٹھی۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ۔''

''اگر نہ چھوڑوں تو......؟'' اس نے ایک مرتبہ پھر اشفا کا نازک ملائم ہاتھ دبایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ بہت برے ہیں۔'' وہ زور زور سے سر دباتے ہوئے بولی۔

''اچھا......''

''بہت ظالم بھی ہیں۔''

''یہ نئی اطلاع ہے۔''

''بہت بدماغ اور غصیلے ہیں۔''

''میری خوبیوں کے متعلق تمہارے پاس کس قدر جامع معلومات ہیں۔'' مرتضٰی نے اسے سراہا۔

''میرا بس چلے نا......''

''تو تم میرا سر دبانے کی بجائے گلا دبا دو۔'' مرتضٰی نے اپنے ماتھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر گرفت میں لے کر اک نرم سا بوسہ دیا۔ وہ جھنجلاتے ہوئے پیچھے ہٹی۔

''اپنی حد میں رہیں۔''

''میری حدود کا تعین کر دو۔'' بڑی دلربائی سے کہا گیا۔

''آپ خاموشی سے سر دبوائیں' میرے ساتھ فری ہونے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ ایک ناقابل برداشت کام جانے کیسے دل پر پتھر رکھ کے کر رہی تھی۔ مرتضٰی کو کافی اطمینان ہوا۔ وہ اسے چڑا کر دلی سکون محسوس کرتا تھا۔

''تو کیا پڑوسیوں کی خواتین سے فری ہونے کی کوشش کروں۔'' اس کا موڈ بدل رہا تھا۔ اشفا کو خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی۔

''میں جاؤں۔''

''اوں ہوں...... یہاں لیٹو۔'' مرتضٰی نے اپنے برابر جگہ بنا کر اسے زبردستی جھٹکا دے کر لٹایا تو وہ چلا اٹھی۔

''آپ بہت بے ایمان ہیں۔''

''کبھی تعریف بھی کر دیا کرو۔'' وہ اس کی دسترس میں قیدی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

''مرتضٰی آپ......'' اشفا نے غصے سے اپنا سر اس کے کندھے سے دے مارا۔ پھر دو تین مرتبہ اس نے یہی عمل دہرایا۔ اس نے کروٹ کے بل تھوڑا سا سر اٹھا کر اشفا کے غصیلے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اشفا حیران حیران سی اسے مسکراتا دیکھتی رہی اور پھر اس کی پیش قدمی پر دانت پیس کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کبھی اس حجرے سے باہر بھی نکل آیا کرو۔'' آج ہفتے بعد اسے پھر گھر کی یاد آئی تھی اور آتے ساتھ ہی اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔

''کوئی اچھے کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس۔'' اس کے قدرے بے رنگ سے سلوٹ زدہ گلابی کاٹن کے کپڑوں کو انتہائی ناگواری سے دیکھا گیا تھا۔

''آپ تو روزانہ مجھے شاپنگ کرواتے ہیں۔'' اشفا تنک اٹھی تھی۔

''اور یہ جو الماری بھری پڑی ہے یہ کپڑے کیا ہوئے۔''

''اب میں اس حالت میں یہ ریشمی بھاری سوٹ پہنوں۔'' اس نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے لا دوں گا کسی دن۔'' مرتضٰی نے جان چھڑوانے والے انداز میں کہا تو وہ تپ اٹھی۔

''میں نے منت نہیں کی کہ مجھے نئے کپڑے لا کر دیں۔''

''بہت بولتی ہو تم۔'' مرتضٰی قدرے بھنایا۔ ''ایک سوال کرو تو دس جواب ملتے ہیں۔''

''نہیں بولتی' منہ پر ٹیپ لگا لیتی ہوں پھر خود ہی میری جان کھائیں گے کہ خاموش کیوں ہوں میں۔''

''بہت نخرے دکھانے لگی ہو۔'' مرتضٰی نے پرسوچ انداز میں کہا تو وہ بلبلا اٹھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں لہٰذا اللہ کیلئے مجھے آرام کرنے دیں۔''

''لیں' میں نے کب ملکہ عالیہ کے آرام میں خلل ڈالا ہے۔'' مرتضٰی مصنوعی حیرت سے بولا۔ وہ سر

تک چادر تان چکی تھی۔ مرتضیٰ گہری سانس کھینچتا لائٹ آف کر کے باہر نکل گیا۔

رات کو اس کی واپسی ہوئی تو ہاتھ میں ڈھیروں شاپرز تھے۔ ایک شاپر نمرہ اور ثانیہ کو دوسرا سائرہ اور ثمن کو جبکہ باقی شاپرز اشفا کے کمرے میں بھجوا دیئے گئے۔ ساتھ میں اسے باہر آنے کا آرڈر بھی دیا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ منہ پھلائے آ گئی تھی۔ مرتضیٰ کہیں جانے کیلئے تیار بیٹھا تھا۔ دادی نے اسے آتا دیکھ کر محبت سے کہا۔

''جادھی رانی' میر پتر تجھے کہیں گھما پھرا لائے سارا دن گھر میں چپکی پڑی رہتی ہو۔'' یقیناً دادی نے سفارش کی تھی تبھی شہزادہ عالم اس کی ذات پر احسان کرتے ہوئے اسے باہر آنے کا کہہ کر خود چلے گئے۔

اشفا بھی جلتی بھنتی اس کے پیچھے آ گئی تھی۔

''کیا ضرورت تھی اس احسان کی۔'' وہ زیادہ دیر کہاں خاموش رہ سکتی تھی۔

''کون سا احسان......؟'' مرتضیٰ نے حیرانی سے سوچا اور پھر سمجھنے والے انداز میں بولا۔

''اوا چھا......ایسے چھوٹے موٹے احسانات ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔'' انداز بھرپور شاہانہ تھا۔ وہ جل کر رہ گئی۔

ڈیرے کے قریب گاڑی رکی تو مکرم جان نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ یہ مرتضیٰ کا ملازم خاص تھا۔ ڈیرے پر ہی اس کی بھی رہائش تھی......مرتضیٰ نے مکرم کو کچھ ہدایات دیں اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''آج تمہیں اپنی فیورٹ شخصیت سے ملواتا ہوں۔''

''نہ جانے کون ہے؟'' اشفا کو تجسس نے گھیرا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک جھگی کے قریب رکی اور اس جھگی میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔

''راجہ حسن دا کنج راہ بھل آیا ہے۔'' (حسن کا راجہ کیسے راستہ بھول آیا ہے۔)

''مائی میرا! یہ اشفا ہے میری بیوی۔'' مرتضیٰ نے تعارف کروایا تو مائی کھل سی اٹھی۔

''ماں واری! سوہنی ہے رج کے سوہنی۔''

اشفا کو اس بوڑھی کی باتیں سن کر بہت لطف آیا تھا۔ اس نے مائی کی بنائی مچھلی کو بھی بہت شوق سے کھایا۔ وہ اک خوبصورت شام گزار کر واپس آئی تو موڈ کافی خوشگوار تھا۔ راہداری میں ہی مہوش سے ٹاکرا ہو گیا۔ وہ انہیں دیکھ کر اک تنفر سے بھری نگاہ ڈالے بڑے کمرے میں گھس گئی تھی۔

انہی دنوں نجمہ پھوپھو نے ثانیہ کو اپنے بیٹے عاشر کیلئے مانگ لیا تو گھر میں شادی کے شادیانے گونج اٹھے۔

''لوگ کافی چھپے رستم نکلے ہیں۔'' نمرہ مسلسل ثانیہ کو چھیڑ رہی تھی۔

''بکواس نہیں کرو۔'' وہ شرمائی شرمائی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اشفا نے بھی گھریلو امور میں دلچسپی لی تو تائی امی اور دادی خوشی سے کھل اٹھیں۔

عامر اور نقی، تقی کی آمد کے ساتھ گھر میں مزید رونق ہو گئی تھی۔ یہ سب ڈھولکی پر الٹے سیدھے گانوں

کی پریکٹس کر کے نہ جانے کون کون سے شہرت یافتہ سنگرز کی روحوں کو تڑپاتے۔ اس فنکشن میں بھی مرسلین چچا کی فیملی دور دور رہی تھی۔ مہوش نے سرے سے شرکت ہی نہیں کی تھی البتہ عروبہ گھڑی دو گھڑی کیلئے اپنی والدہ کے ہمراہ آئی تھی۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو زندگی معمول پر آ گئی۔ پورے دو ماہ بعد اس نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا تو گھر میں گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی۔

تائی امی اور دادی نہال سی غریبوں میں مٹھائیاں اور پیسے تقسیم کر رہی تھیں۔ ایک ہفتے بعد اس کے بیٹے کا شاندار عقیقہ کیا گیا تھا جس میں پورے خاندان نے شرکت کی۔

یہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے جب ایک رات اشفا نے مہوش کو بری طرح روتے دیکھا وہ اس قدر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی کہ اشفا کا دل پسیج گیا۔ وہ انسانی ہمدردی کے ناتے اس کے قریب گئی تو مہوش نے اسے ایک عجیب سی داسان سنا ڈالی۔

اشفا گم سم سی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''کیا یہ سچ ہے؟''

''میری آنکھوں میں دیکھ لو'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ اشفا حیرت زدہ سی رہ گئی۔ ان آنکھوں میں رتجگوں کے اتنے عذاب تھے کہ اشفا کو اپنا دل پگھلتا محسوس ہوا۔ یہ عشق تھا یا جنون' اشفا سمجھ نہیں پائی تھی۔ کیا محبت میں کوئی اس قدر پاگل ہو جاتا ہے۔

''تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''تم ہی تو سب کچھ کر سکتی ہو اگر چاہو تو۔'' مہوش نے لہو رنگ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کیا کروں؟'' اشفا حیران ہوئی۔

''تم چلی جاؤ کہیں دور بہت دور' واپس امریکہ۔''

''امریکہ......'' بہت عرصے سے دلی خواہش کو مہوش نے زبان دے ڈالی تھی۔

''تم بیچ میں نہیں آتیں تو آج مجھے یوں سسکنا نہ پڑتا۔ تمہارے سامنے تو دنیا پڑی تھی اور میرے لئے پوری دنیا صرف مرتضٰی تھا'' وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اشفا کے دل پر گر رہے تھے۔

''عطیہ چاچی اور ہارون چچا نے تایا ابو کو مجبور کیا تھا کہ وہ تمہارا رشتہ دیں۔ اگر تایا اور ابو ہارون چچا کو زبان نہ دے چکے ہوتے تو یہ جنگ میں جیت جاتی مگر...... تم بیچ میں آ گئیں۔ میری محبت اور خوشیوں کے درمیان دیوار تم بنی تھیں۔ مرتضٰی بھی مجبور ہو گیا تھا ورنہ وہ کبھی بھی تم سے شادی نہ کرتا۔ تایا ابو کی کسی بات سے' کسی حکم سے آج تک اس نے سر نہیں اٹھایا تو اس معاملے میں کیسے بول پڑتا۔ اس نے بھی قربانی دے ڈالی مگر نقصان صرف میرے حصے میں آیا۔ سارے عذاب میرے لئے ہیں' سارے غم میری جھولی میں آ پڑے ہیں۔ سارے کرب سارے درد مجھ سے چمٹ گئے ہیں۔'' وہ کرلا رہی تھی اور اشفا ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''محبت کے اس سفر میں' میں اکیلی تھوڑی تھی مرتضیٰ بھی میرے ہم قدم تھا۔ مجھے اس مقام پر لا کر اس نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب کچھ پا چکا ہے اور میں خالی دامن رہ گئی۔'' مہوش کی سسکیاں رات بھر اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اسے آج وجہ معلوم ہوئی تھی کہ مہوش ابھی تک کیوں نہیں شادی کیلئے مانتی۔ ہر رشتے کو انکار مہوش کی طرف سے ہوتا تھا۔ اسے مرتضیٰ کی سنگدلی کا سوچ کر گھن آنے لگی تھی۔ اگر وہ ثابت قدم رہتا تو تایا ابو ضرور اس کی بات مان لیتے مگر وہ بھی سطحی سوچ والا کمزور مرد نکلا۔

خوب صورتی اور دولت کو ترجیح دینے والا۔ وہ مہوش سے زیادہ حسین تھی دولت مند اور تعلیم یافتہ تھی اور مرتضیٰ نے خسارے کا سودا تو ہرگز نہیں کیا تھا۔ ان تمام تلخ سچائیوں کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں دبا غصہ' اس کی نسوانی انا اور غرور کی وہ دھجیاں بھی تھیں جو اس کے ساتھ زبردستی کر کے ماما پاپا نے بکھیر ڈالی تھیں۔

کیا وہ اتنی گری پڑی تھی کہ ماما نے ہاتھ جوڑ کر تایا ابو کو رشتے کیلئے منایا۔ وہ ساری رات روتی رہی اور سوچتی رہی۔

اس نے مہوش کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر چہ وہ کوئی قربانی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے امڈتے اشتعال پر بند باندھا چاہ رہی تھی۔ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی زبردستی کا بدلہ لینا چاہ رہی تھی۔

وہ ان سب کو جتا دینا چاہتی تھی کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے مگر اس سب کے باوجود ماما پاپا نے خود سے رشتے کی بات کر کے اسے ہلکا کر دیا تھا۔ اسے یہ سب اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔

اگلی صبح اس نے مہوش کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مہوش نے اس کے ساتھ بھرپور تعاون کا وعدہ کیا اور جس رات مرتضیٰ کسی کام کے سلسلے میں سندھ گیا اسی رات چپکے سے مہوش نے اس کی سیٹ کنفرم ہو جانے کی خوشخبری سنائی۔

''تم شازم کو یہیں چھوڑ دو۔''

''نہیں' ہرگز نہیں۔'' اشفا نے شدت سے اس کی بات کو رد کیا۔

''دیکھو اشفا ابھی شازم کو لے جانا مناسب نہیں۔ میں موقع کی تلاش میں رہوں گی اور بہت جلد شازم تمہارے پاس ہوگا۔ ابھی صرف تم یہاں سے نکلنے کی کرو۔ ڈرائیور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

''مگر میرا بچہ۔'' اشفا کی ممتا بے چین تھی۔

''شازم اگر تمہارے پاس رہا تو مرتضیٰ تمہیں کبھی چین نہیں لینے دے گا۔ تم جانتی ہو وہ اپنے بچے سے کتنی محبت کرتا ہے۔'' مہوش جھنجلائی۔

''میں بھی تو شازم سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ میں کیسے رہوں گی اس کے بغیر۔'' وہ رو دی تھی۔

''اشفا! میری بات سمجھو اور نکلنے کی کرو۔ تم واپس چلی جاؤ گی۔ یہی تھی نا تمہاری سب سے بڑی خواہش' تو پھر دیر مت کرو۔''

''مگر مہوش! تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ میں شازم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''تو پھر ساری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ گزار دو' جو نہ تم سے محبت کرتا ہے نہ تمہاری عزت۔ جس کی زندگی میں تم زبردستی شامل ہوئیں۔ اگر سمجھوتہ کرنا چاہتی ہو تو رہو اس زندان میں۔'' مہوش نے تلخی سے کہا۔

''اپنے ٹوٹے وقار کی کرچیوں کو سمیٹتی رہو۔ سب جانتے ہیں کہ تم انا، چاہتی ہو۔ تمہارے ماں باپ نے تایا ابو کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے کہ ان کی بگڑی بیٹی کو قبول کر لیں۔'' مہوش نے چنگھاڑ کر کہا تو اشفا کی ہمت جواب دے گئی۔ اب جو وہ فیصلہ کر چکی تھی اس پر سے ہٹنا بہت مشکل امر تھا اور یوں وہ مہوش کی باتوں کے جال میں پھنس گئی' وہ شیطان کے بہلاوے میں آ کر اپنی جنت کو ٹھوکر مار آئی۔ وہ خود غرض بن گئی۔ اس نے اپنی انا پر ممتا کو قربان کر دیا۔ وہ اپنے دو ماہ کے شازم کو بلکتا چھوڑ آئی۔

امریکہ پہنچ کر اسے یوں لگا وہ ایک دم خالی خالی ہو گئی ہے۔ اس نے تمام رابطے توڑ دیئے' بس مہوش سے ہی کبھی کبھی فون پر بات ہوتی وہ بھی صرف شازم کیلئے ہی کہ اس کی خیریت کا پتا چلتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مہوش نے تمام نمبرز بدل دیئے تو وہ نام نہاد رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔

یہاں آ کر اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ گھر اگرچہ بند تھا مگر اس کی حالت کافی خستہ تھی۔ سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ ہوٹل پر کسی انڈین نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ وہ انڈین پہلے ہوٹل کا منیجر تھا اور اب مالک بنا بیٹھا تھا۔ گھر بھی پتا چلا کہ اسی منیجر نے کسی اور انگریز کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے اور وہ انگریز فیملی چھٹیاں گزارنے کسی اور شہر میں گئی ہے۔

اس تمام صورت حال نے اشفا کے اعصاب بے جان کر ڈالے۔ مرینہ سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دم حالات نے کروٹ بدلی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ بینک سے رقم نکلوائی اور منیجر کے خلاف مقدمہ درج کروایا۔ ساڑھے چار سال مقدمہ کورٹ میں چلتا رہا اور بالآخر وہ ناصرف مقدمہ جیت گئی بلکہ منیجر انیل کو قید بامشقت کی سزا بھی سنا دی گئی اور جرمانہ بھی کافی سارا سے ادا کرنا پڑا۔

جس شام وہ مقدمہ جیت کر کورٹ سے نکلی اسی شام مقامی مارکیٹ میں اس سے مرینہ کی ملاقات ہوئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کا صاف رنگت والا آدمی بھی تھا۔ مرینہ نے اس کا تعارف اپنا شوہر کہہ کر کروایا تو اشفا کو بے حد حیرانی ہوئی۔ اشفا نے دیکھا کہ مرینہ بے حد خوش ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہے اشفا کو دلی خوشی محسوس ہوئی۔

مرینہ سے ملاقات کے بعد اشفا کو احساس زیاں مزید کچوکے لگانے لگا۔ وہ جو کچھ کھو چکی تھی اسے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اس سب کو پالے گی۔ ایک دن وہ مرینہ کے پوچھنے پر پھٹ پڑی اور اس نے کتاب زیست کا صفحہ صفحہ اسے سنا ڈالا۔ مرینہ تاسف سے سنتی رہی اور جب بولی تو اس کے لہجے میں یقین تھا۔

''تم لوٹ جاؤ اشفا! تم اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کو پالو گی۔''

''وہ بہت انا پرست ہے وہ مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔'' اشفا نے روتے ہوئے کہا۔

''ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں' پھر اس کے پاس تمہارا بچہ ہے۔'' مرینہ نے اسے پاکستان

بھیجنے کیلئے اور مرتضیٰ سے معافی مانگنے کیلئے تیار کر لیا۔ وہ بہت ہمت' حوصلے اور امید کے دیے کو تھام کر پاکستان آئی تھی۔ مگر پہلے ہی قدم پر مہوش کے رویے نے اسے توڑ ڈالا تھا۔ وہ ابھی تک بے یقین سی بیٹھی تھی کہ یہ وہ ہی مہوش ہے۔

''مجھے معاف کر دیں دادی جان۔'' وہ ان کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا دھی رانی! کیا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔'' دادی کی بوڑھی آنکھیں بھی نم تھیں۔

''دادی جان! مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں کیسے شازم کو چھوڑ کر چلی گئی۔ آج بھی سوچتی ہوں تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔'' وہ شازم کو سینے سے لگائے رنجیدگی سے بولی۔

''مما! اب نہ جانا......'' شازم نے اپنے نرم منے سے ہاتھ کو ماں کے گال پر رکھ کر کہا تو وہ اس کی اس معصوم ادا پر مسکرا اٹھی۔ اسی پل ثانیہ بھی اپنے چھوٹے بیٹے کو اٹھائے چلی آئی۔

''توبہ یہ شازم بہت تیز نکلا۔ ماں کو دیکھ کر فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا ہے اس نے۔'' ثانیہ اسے ماں سے لاڈ کرتے دیکھ کر خوش دلی سے بولی۔

گھر میں پہلے سے ہی خوشگوار ہلچل سی تھی۔ تائی امی سے پتا چلا کہ نمرہ اور عامر کی شادی قریب ہے۔ پھوپھو نے دونوں بیٹوں کیلئے بھتیجوں کو مانگ لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب گھر میں بیٹیاں موجود ہیں تو باہر کیوں دیکھیں۔

عاشر اور ثانیہ لاہور میں مقیم تھے اور شادی کے سلسلے میں ہی ان کی آمد ہوئی تھی۔ عامر کو بھی آفس کی طرف سے گھر مل گیا تھا۔ شادی کے بعد نمرہ بھی لاہور شفٹ ہو جاتی۔ اس تمام عرصے میں سائرہ اور ثمن بیاہ کر کراچی اور ایبٹ آباد چلی گئی تھیں۔

مہندی سے ایک رات قبل ان کی آمد ہوئی تھی۔ اشفا کو دیکھ کر انہیں بھی خوشگوار حیرت نے گھیرا۔ اگرچہ سب اس سے بدگمان تھے' نہ جانے مہوش نے کیا بتا کر ان سب کو اس سے متنفر کیا تھا اور پھر اس کا اپنا عمل بھی قابل معافی نہیں تھا اس کے باوجود تایا ابو اور دادی نے اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں۔ بس اک خوف تھا تو صرف مرتضیٰ کی طرف سے' نہ جانے اس کا ردیہ کیا ہو۔ یقیناً وہ اس دفعہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا۔

اس نے بہت ہمت اور اعتماد کے ساتھ شازم کے ہمراہ مرتضیٰ اور اپنے مشترکہ کمرے میں قدم رکھا تھا۔ اسے اپنے روٹھے پیا کو منانا تھا۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا تھی اور میر محمد مرتضیٰ حیدر کو بتانا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرنے لگی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ مرتضیٰ اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا مگر پھر بھی وہ پراعتماد تھی۔

''وہ میری محبت سے کہاں تک بھاگے گا۔'' اس نے یقین سے سوچا۔

''مجھے اسے منانے کیلئے اگر گڑگڑانا بھی پڑا' اس کے قدموں میں جھکنا بھی پڑا تو میں جھک جاؤں گی۔'' وہ شازم کو سلاتے ہوئے مسلسل مرتضیٰ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ جوں ہی اس کی نگاہ شازم کے چہرے اور کھلی آنکھوں پر پڑی تو وہ چونک اٹھی۔

''آپ ابھی تک نہیں سوئے بیٹا۔''

''مما! نیند نہیں آ رہی۔'' شازم نے اس کے بازو میں سر گھسا کر باریک سی آواز میں کہا تو وہ اس کی پیشانی پر سے بال ہٹا کر چومتے ہوئے بولی۔

''کیوں نیند نہیں آ رہی مما کی جان کو۔''

''شازم بابا کے پاس سوتا ہے نا۔'' اس نے معصومیت بھری وجہ بتائی تو اشفا نے چونک کر دیکھا۔

''کیا بابا روزانہ گھر آتے ہیں رات کو۔''

''شازم کیلئے آتے ہیں' پھر جب شازم سو جاتا ہے پھر چلے جاتے ہیں۔''

''اس' آپ کو یہ بات کس نے بتائی۔'' اشفا نے حیرانی سے پوچھا۔

''نمرہ پھوپھو نے۔''

''پھر آج اور کل بابا کیوں نہیں آئے۔'' اشفا کو تجسس سا ہوا۔

''دادو کہتی ہیں انہیں کام ہے اور وہ دور گئے ہیں۔'' شازم نے ہاتھ کے اشارے سے سفر کی دوری کا بڑے معصوم انداز میں بتایا تھا۔

''دادو نے یہ نہیں بتایا کہ کب آئیں گے؟''

''نائیں......'' اس نے نفی میں دائیں بائیں سر ہلایا۔

''مما!''

''جان۔''

''اب شازم کو ڈر تو نہیں لگتا۔''

''نہیں۔''

''اچھا' بھلا وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ اب مما جو شازم کے پاس ہیں۔'' اشفا کو خود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ کیسی سنگدل ماں تھی جو اپنے معصوم بچے کو تنہا چھوڑ گئی۔ اس وقت جب اسے ماں کی شدت سے ضرورت تھی۔

''مما'' شازم نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر بازو ہلایا تو وہ چونکی۔

''مما! اب آپ کہیں مت جانا۔ بس شازم کے پاس رہنا۔''

''میں اپنے بچے کے پاس رہوں گی ہمیشہ۔'' اشفا نے اس کے معصوم خدشات کو رفع کیا۔ ''اب سو جاؤ بٹیا! میں آپ کو کہانی سناتی ہوں۔'' اشفا نے اسے کہانی سنانا شروع کی تو وہ چند منٹوں میں ہی گہری نیند سو گیا۔

اگلے دن مہندی کی رسم مشترکہ تھی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ صبح سے ہی شروع تھا۔ پہلی مرتبہ اشفا بھی ہر کام میں پیش پیش تھی۔ سب کو ہی اس کے رویے میں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ رات کو مرتضیٰ بھی آ گیا تھا اسے خبر ہو چکی تھی اشفا کے آنے کی۔ شاید اسی لئے وہ مردان خانے سے نہیں آیا تھا بلکہ شازم کو وہیں بلا لیا گیا۔

اشفا مہندی کی رات بہت توجہ سے تیار ہوئی تھی۔ وہ اپنے حسن سے آگاہ تھی۔ اسی لئے جب گرین کلر

کا سوٹ جس کے گلے دامن اور آستین پر سلور کام ہوا تھا پہنا تو گویا اس کا پورا وجود جگمگانے لگا تھا۔ اس نے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ کس کی سیاہ رنگ بدلتی آنکھوں کے حصار میں رہنا تھا۔

وہ بھرپور تیاری کے ساتھ جب نیچے آئی تو رسم شروع ہو چکی تھی۔ عاشر اسے آتا دیکھ کر خفگی سے بولا۔

''اب آئی ہیں آپ' بمشکل تو میں بہانے سے مرتضیٰ کو گھسیٹ کر لایا تھا مگر آپ نے سارا پروگرام غارت کر دیا۔''

''مرتضیٰ! کہاں ہیں؟'' اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''چلا گیا ہے' اسے ہوٹل کے انتظام کو دیکھنا تھا۔'' عاشر نے خفگی سے بتایا تو اشفا کا چہرہ اتر گیا۔

''اور شازم......'' وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر شازم کو تلاش کر رہی تھی۔

''وہ بھی اسی کے ساتھ گیا ہے۔''

''مگر شازم کو تمہیں نہیں جانے دینا تھا۔'' اشفا پریشانی سے بولی۔

''شازم تو اکثر مرتضیٰ کے ساتھ جاتا رہتا ہے۔''

''اچھا......'' اشفا نے حیرت سے کہا۔

''وہ مرتضیٰ کو تنگ کرے گا۔''

''نہیں...... وہ مرتضیٰ کو تنگ نہیں کرے گا۔ بلکہ دور دور کے دوروں پر تو وہ خوشی خوشی باپ کے ساتھ جاتا ہے۔'' عاشر نے بتایا اور پھر ثانیہ کو آواز دیتا پلٹ گیا تو اشفا بھی مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر رسم میں شرکت کی غرض سے صحن میں چلی گئی۔

رات مرتضیٰ اور شازم کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ مرتضیٰ نے سوئے ہوئے شازم کو احتیاط سے اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اشفا اسی کے کمرے میں رہ رہی ہے۔ وہ اشفا کی ڈھٹائی بلکہ بے شرمی پر حیرت زدہ تھا کوئی اور عورت ہوتی تو شرمندگی کے مارے منہ چھپائے پھرتی۔ لوگوں کی باتوں کے خوف سے گوشہ نشین ہو جاتی مگر یہ اشفا ہارون تھی جو کہ چھ سال پہلے رات کی تاریکی میں اپنے کم سن بیٹے کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اپنی ممتا پر کیچڑ اچھلتے دیکھ' سن کر بھی بڑی ڈھٹائی سے اسی گھر میں رہ رہی تھی۔

اس نے اپنی ممتا کو خواہشات اور آرام پر قربان کر دیا۔ لوگوں کی زبانیں تو نہیں روکی جا سکتیں۔ مرتضیٰ نے خود کچھ خواتین کی گفتگو سنی تھی۔

مرتضیٰ کمرے میں داخل ہوا تو اسے بیڈ پر نیم دراز پایا۔ اشفا جاگ رہی تھی۔ یہ بھی ایک حیران کر دینے والا واقعہ تھا۔ اسے اپنی نیند اور آرام کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ وہ سوتی جاگتی تھی اور اکثر جب مرتضیٰ اسے گہری نیند سے جگا دیتا تو ان دونوں کی لڑائی کا ہونا لازمی تھا۔ اسے یاد تھا جب ایک مرتبہ ساون کی پہلی بوند نے کمرے کی کھڑکی پر دستک دی تو مرتضیٰ نے اشفا کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''بارش۔'' مرتضیٰ نے شرگوشی نما آواز میں کہا تو اشفا تپ اٹھی۔

''آپ نے بارش کا بتانے کیلئے میری نیند خراب کر ڈالی۔'' غصے کے مارے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے کہ غصے میں تم بہت خوبصورت لگتی ہو۔'' مرتضیٰ نے اسے چھیڑا تو وہ آگ بگولا ہوگئی۔

''کیوں جگایا ہے مجھے' اب مجھے دیر تک نیند نہیں آئے گی۔''

''تو میں بھی کب چاہتا ہوں کہ تم سو جاؤ۔ اپنی نیند کی بڑی پروا ہے برابر لیٹے شوہر کی بے چین کروٹوں کا کچھ خیال نہیں۔ اتنے دنوں بعد آیا ہوں' تمہیں تو میرے آگے پیچھے پھرنا چاہئے تھا دل بہلانے کا کچھ سامان کرنا چاہئے تھا مگر یہاں تو نیند ہی کسی پل پوری نہیں ہوتی۔''

''کتنے جھوٹے ہیں آپ' روز تو رات کو آ جاتے ہیں اور نیند میری کیسے پوری ہو' اتنا تو جگاتے ہیں آپ۔'' وہ واقعی بہت منہ پھٹ اور بے حد بولڈ تھی۔ ہر بات بغیر لگی لپٹی کے کہہ دینے والی اگرچہ کافی مرتبہ اسے بہت غلط ملط بول لینے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ وہ کیا بول گئی ہے۔

''روز آ جانے کا طعنہ دل کو لگا ہے۔'' مرتضیٰ نے مسکرا کر اس کے بالوں کو چھیڑا تو وہ جھنجھلائی۔

''ہاتھ مت لگایئے گا مجھے۔''

''کیا کرلوگی۔'' مرتضیٰ نے مزید ایک عدد بھرپور شرارت کر ڈالی تو اس کا غصو سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

''چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں گی کہ آپ رات کو چوری چھپے آتے ہیں۔''

''او...... او یہ غصب نہ کرنا۔'' اس نے جان بوجھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ ''ویسے آج کیوں طعنوں کی بوچھاڑ کر ڈالی ہے۔'' مرتضیٰ نے اس کی روشن پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کروٹ کے بل قدرے اونچا ہو کر اس کے تنے تنے نقوش کو میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے چھونے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ اس کی مزید پیش قدمی کو روکنے کی غرض سے تنبیہی لب و لہجے میں بولی۔

''تم کبھی بھی اچھی مزاحمت نہیں کرسکیں۔'' سیاہ آنکھیں اب مسکرا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کیا طلسم تھا کہ جب بھی وہ اسے اس انداز میں دیکھتا اشفا خود بخود نرم پڑ جاتی۔

''میں...... میں آپ سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔'' اسے جب کوئی سخت الفاظ نہ سوجھے تو وہ جھنجھلا کر بولی۔

''یہ اچھی دھمکی ہے۔'' مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کے گرد بازوؤں کے حلقے کو مزید تنگ کیا تو وہ بھینچی آواز میں بلبلائی۔

''مرتضیٰ......''

''مرتضیٰ ......'' شازم کو بیڈ پر لٹا کر وہ جوں ہی پلٹا اشفا کے لبوں نے جنبش کی دوسرے ہی پل وہ اس کے مقابل تھی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''تم سے مطلب۔'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''مرتضیٰ! آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ میری بات تو سنیں۔ میں آپ کی تمام بدگمانی دور کر دوں گی۔ پلیز آپ مجھے موقع تو دیں اپنی صفائی پیش کرنے کا۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی تو مرتضیٰ نے تنفر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

''مجھے تمہاری بات نہیں سننا۔ آئندہ مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا۔

''کیوں نہ روکوں' میں آپ کی بیوی ہوں۔''

''بہت جلد یاد آ گیا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔''

مرتضیٰ کا لہجہ زہر زہر تھا۔ اشفا پشیمان سی نگاہ جھکا گئی۔

''ہٹو......'' مرتضیٰ نے چنگھاڑ کر کہا جبکہ اشفا اسی طرح دروازہ تھامے راستہ روکے کھڑی رہی۔

''سنا نہیں تم نے۔''

''نہیں سنا۔'' وہ بھی تپ اٹھی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ لگاؤں گا دو ہاتھ۔''

''آپ جب تک میری بات نہیں سنیں گے میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔'' وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ مرتضیٰ نے ایک لمحے کیلئے سوچا اور پھر جھٹکے سے اسے دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور پھر خود تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا جبکہ اشفا دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔

یہ وہ مرتضیٰ تو نہیں تھا جو اشفا کی قربت کیلئے بہانوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ یہ تو کوئی اور مرتضیٰ حیدر تھا۔ اشفا کو ایک دم محسوس ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔

☆☆☆

اگلا دن بارات کا تھا۔ بھرپور مصروفیت کا دن' اشفا تمام خیالوں کو جھٹک کر ثانیہ اور سائرہ کے ہمراہ مختلف کام سرانجام دے رہی تھی۔ آتے جاتے کبھی مرتضیٰ پر بھی نظر پڑ جاتی' مگر جس طرح وہ اسے نظرانداز کر رہا تھا' یہ سب اشفا کیلئے انتہائی تکلیف دہ اور توہین آمیز تھا۔ اشفا تو اس کی بھرپور محبت اور بے باک اظہار کی عادی تھی۔ اس سے مرتضیٰ کا یہ رویہ برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

چونکہ فنکشن کی ارینج منٹ ہوٹل میں تھی۔ لہٰذا سب ہی تیار ہو کر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور ہوٹل میں پہنچ گئے۔ آخر میں اشفا اور شازم تیار ہو کر نکلے تو پورا گھر بھائیں' بھائیں کر رہا تھا۔ اشفا نے شازم کو باہر بھیجا' تا کہ وہ دیکھ کر آئے کہ کوئی گاڑی موجود ہے۔ تھوڑی دیر بعد شازم منہ لٹکائے آ گیا۔

''مما! گاڑی تو کوئی نہیں۔ اب ہم کیسے جائیں گے؟''

''اچھا۔ ٹھہرو میں عاشر سے فون پر بات کرتی ہوں۔'' اشفا نے خود کو تسلی دے کر عاشر کو فون کیا تو وہ سرعت سے بولا۔

''بھابھی! آپ تیار رہیے' مرتضٰی بس پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

''بابا ہمیں لینے کیلئے آ رہے ہیں۔'' اس نے شازم کو تسلی دی اور خود کچن میں مصروف ملازموں کو کچھ ہدایات دے کر صوفے پہ آ کر بیٹھ گئی۔ شازم بے چینی کے عالم میں اندر باہر کے چکر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کے ہارن سنائی دیا تو وہ اچھل کر بولا۔

''مما! جلدی آئیں۔''

اشفا اپنی ہی جھونک میں چلتی گاڑی تک آئی تو گاڑی کے پاس ادب سے سر جھکائے کھڑے مکرم جان کو دیکھ کر سلگ اٹھی۔

''بابا! کدھر ہیں؟'' شازم نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر بے چینی سے پوچھا۔ اشفا کو بھی مجبوراً پیچھے بیٹھنا پڑا تھا۔

''وہ مہمانوں کی وجہ سے نہیں آ سکے۔ ان کے کچھ دوست ابھی ابھی پہنچے ہیں۔'' مکرم نے شازم کو تو مطمئن کر دیا تھا' مگر اشفا مسلسل سلگ رہی تھی۔

میرج ہال میں پہنچ کر بھی اس کا موڈ سخت آف رہا۔ اس نے غصے میں کھانا بھی کھایا' بس منتیں کر کر کے شازم کو کھلاتی رہی۔ رخصتی کے بعد دلہن اور دولہا نے گھر ہی آنا تھا۔ لہٰذا جلد ہی ہوٹل سے فارغ ہو گئے۔

گھر آ کر اشفا نے غصے کے عالم میں چوڑیاں اتاریں' میک اپ صاف کیا۔ جیولری اتاری اور پھر زبردستی شازم کو تھپک تھپک کر سلایا۔ وہ مسلسل ریں ریں کر رہا تھا۔ مرتضٰی کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا' مگر اشفا نے اس کی ایک نہ سنی۔

''آج بابا نے شازم کو پیار بھی نہیں کیا' اٹھایا بھی نہیں۔'' اس نے ڈھیروں شکایتیں اکٹھی کر کے رکھی تھیں۔ اشفا اسے سمجھاتی رہی۔

''وہ مصروف تھے بیٹا! ابھی بابا آپ کو آ کر بہت پیار کریں گے۔ اب سو جاؤ۔''

''نہیں سونا شازم کو۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''چلو شاباش میں کہانی سناتی ہوں' شازم آنکھیں بند کرے۔'' اشفا نے اسے پچکار کر کہا' تو وہ رونے لگا۔

''شازم! میں ماروں گی آپ کو۔''

''بابا پاس جانا ہے۔'' وہ منمنایا۔

''جاؤ' چلے جاؤ بابا کے پاس۔'' اشفا نے غصے سے کہا۔

''شازم اکیلا کیسے جائے مما! شازم کو ڈر لگے گا۔''

''تو میں کیا کروں۔''

''آپ شازم کو بابا پاس چھوڑ آئیں۔'' وہ اس کی گردن پر ہاتھ رکھے بازو پر سر رکھے معصومیت سے بولا۔ شازم کی مسلسل ضد کی وجہ سے وہ اپنی بے عزتی بھلا کے مرتضیٰ کو فون کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''کیا تکلیف ہے؟'' اشفا کی آواز سن کر دوسری طرف سے کٹیلے لہجے میں پوچھا گیا تو وہ بڑے ضبط کے ساتھ بتانے لگی۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں' آپ کے بیٹے کو ہی درد اٹھ رہا ہے۔''

''کیا ہوا ہے شازم کو۔'' وہ پریشانی کے عالم میں تقریباً چیخا۔

''آپ کی یاد آ رہی ہے۔''

''اوہو...... میری بات کرواؤ شازم سے۔'' اس نے ریسیو شازم کو پکڑایا' تو اس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔ مجبوراً مرتضیٰ کو گھر آنا پڑا تھا۔

''میرے بیٹے کو کیا ہوا ہے۔'' اس نے شازم کو بانہوں میں بھینچ کر چوما' تو وہ سوں سوں کرتے ہوئے بولا۔

''مما نے ڈانٹا ہے۔ غصہ کیا ہے کہ شازم سو جائے' مگر شازم نے بابا کے پاس سونا تھا۔'' اشفا دانت پیس رہ گئی تھی۔

''ایک تو یہ بچے بھی نا۔'' اس نے چیزیں سمیٹتے ہوئے زیرلب کہا۔

''چلو میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاتا ہوں۔'' اکثر جب شازم ضد کرتا تو وہ اسے بھی ڈیرے پر لے جاتا تھا' مگر اس وقت شازم نے ایک مرتبہ پھر منمنانا شروع کر دیا۔

''مما بھی شازم کے ساتھ چلیں۔ شازم مما کے پاس بھی سوئے گا۔''

''بہت فتنے ہو تم۔'' مرتضیٰ نے لب بھینچ لئے۔

''بابا! مما سے کہیں نا کہ وہ بھی چلیں۔''

''آرام سے سو جاؤ' بہت ضدی ہو رہے ہو۔'' مرتضیٰ نے ڈانٹا تو وہ منہ بسورنے لگا۔

''مجھے بابا کے پاس نہیں سونا' مما پاس سونا ہے۔'' باپ کی ڈانٹ سن کر وہ اشفا کے ساتھ چپک گیا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اشفا کو ہنسی آ گئی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر بیڈ پر لے آئی۔ مرتضیٰ واپس جانے لگا تو شازم نے پھر پکارا۔

''بابا......''

''کیا ہے شازم! سوتے ہو کہ نہیں۔'' مرتضیٰ پلٹ کر اس کے قریب آیا تو وہ سرعت سے ماں کی گود میں منہ چھپا گیا۔ شازم جوان دونوں سے چاہتا تھا وہ جانتے بوجھتے اس کی باتوں سے نگاہ چرا رہے تھے۔

''شازم بابا اور مما کے ساتھ سونا چاہتا ہے۔'' اشفا کی چادر سے منہ نکال کر شازم نے معصومیت بھرے

انداز میں کہا تو مرتضیٰ اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اشفا نے دل ہی دل میں شازم کی ڈھیروں بلائیں لیں۔

''میری جان تم نے وہ کام کر دیا ہے جو تمہاری ماں نہ کر سکی۔''

☆☆☆

عامر اور نمرہ کے ولیمہ کے بعد زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ مہمانوں کے ساتھ ساتھ سائرہ اور ثمن بھی اپنے گھروں کو سدھاریں۔ ثانیہ اور عاشر بھی لاہور جا چکے تھے۔ کچھ دنوں بعد نمرہ کو بھی چلے جانا تھا۔

شادی کی مصروفیت کی وجہ سے اشفا اپنے لبوں پر مچلتے ان سوالوں کو تو پوچھ نہیں سکی تھی' جو کہ نوک زبان پر مچل رہے تھے۔ ایک دن موقع پا کر اس نے نمرہ کو گھیر لیا۔ وہ بھی اسے تفصیلاً ہر بات بتانے لگی تھی۔ اشفا یہ جانے کو بے تاب تھی کہ مہوش جو کہ یہ چاہتی تھی کہ اشفا اگر چلی جائے تو وہ مرتضیٰ کو حاصل کر لے گی' پھر ایسا کیا ہوا کہ مہوش کو کسی اور کی دلہن بننا پڑا۔ اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ مہوش شوہر سے لڑ جھگڑ کر میکے آئی ہے۔

''مہوش کی اپنی ساس اور نندوں سے نہیں بنتی' اس کا مطالبہ تھا کہ الگ گھر لے کر...... اسے دیں' تب ہی یہ واپس جائے گی۔ اب دیکھو اس کی خواہش پایہ تکمیل تک پہنچتی ہے کہ نہیں۔''

''مہوش شادی کیلئے مان کیسے گئی؟'' اشفا نے بے چینی سے پوچھا۔

''مرسلین چاچو کے بعد چاچی نے زبردستی عروبہ اور مہوش کی شادی کر دی تھی کیونکہ......'' نمرہ کچھ بتاتے بتاتے ایک دم سوچنے لگی کہ اشفا کو بتانا چاہئے کہ نہیں۔ اشفا کے اصرار پر وہ دبی آواز میں بولی۔

''دراصل جب تم چلی گئیں تو پھر چاچی نے امی اور دادی پر بہت دباؤ ڈالا کہ مہوش کا رشتہ مرتضیٰ لالا کیلئے لیا جائے' مگر پھر بھی مرتضیٰ لالا نہ مانے تو چاچی مایوس ہو گئیں' انہوں نے پھر مہوش کی کسی ضد کو نہ مانا اور اس کی شادی کر کے ہی دم لیا۔ تقی کو اس کے ماموں باہر لے گئے اور وہیں ان کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی۔ چھ ماہ پہلے تقی بھی دبئی چلا گیا ہے۔ چاچی میں بھی اب پہلے والا دم خم نہیں رہا۔ تم نہیں جانتیں اشفا! چاچی نے مرتضیٰ لالا کو کتنا بھڑکایا کہ وہ تم جیسی بدکردار اور عیاش لڑکی کی خاطر زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑ رہے ہیں' مگر مرتضیٰ لالا نے ان کی کسی بات کا یقین نہ کیا۔'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی' مگر عامر نے آواز دے کر بلا لیا۔ اسی رات نمرہ بھی عامر کے ہمراہ چلی گئی' تو گھر میں ایک دم تنہائی نے ڈیرے جما لئے۔

ثمینہ چاچی نے اپنا پورشن الگ کر کے بیچ میں دیوار کھڑی کر لی تھی۔ ان کی آمد و رفت بھی اس طرف کم کم تھی۔ جب سے اشفا واپس آئی تھی' مہوش نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ وقت اسی رفتار سے گزر رہا تھا۔

انہی دنوں تمام فرائض کی ادائیگی کے بعد تایا ابو نے حج کیلئے درخواست دے دی۔ رب کے گھر سے ان کا بلاوا آ گیا اور یوں تائی امی' دادی' پھوپھو اور تایا ابو سب اللہ کے گھر کی زیارت کیلئے چلے گئے۔ جاتے سمے تائی اماں نے اشفا کو ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ وہ کافی دیر اسے گھر کے معاملات کے متعلق سمجھاتی رہیں۔ انہوں نے لاکر کی چابیاں اپنی اکلوتی بہو کے حوالے کر دیں۔

''اشفا پتر! مرتضیٰ تم سے ناراض ہے' میں جانتی ہوں۔ تم اسے منا لو وہ ضرور مان جائے گا۔ پہلے تم ہم

سے بدگمان تھیں۔ اب مرتضیٰ تم سے بدگمان ہے' یہ غلط فہمیاں کیونکر بیچ میں آ گئیں؟"

"تائی اماں! میں نے اپنی نادانی میں اپنا بہت سا نقصان کر لیا ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"ہر نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے' مگر کچھ نقصان ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں۔ جو غلطی تم سے سرزد ہوئی ہم نے تمہیں کھلے دل سے معاف کر دیا' مگر بیٹا! مرتضیٰ کو منانا اب تمہارا کام ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے' اس کا غصہ وقتی ہے' تم پہل کرو گی تو یقیناً اس کا غصہ اتر جائے گا۔"

"وہ مجھ سے بھلا کہاں محبت کرتے ہیں؟" اس کی رنجیدگی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"جھلی دھی! عورت تو مرد کی ایک نگاہ سے پہچان لیتی ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتیں تائی اماں!" اس نے آزردگی سے کہا۔

دادی اور پھوپھو نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ تایا ابا بھی بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ رات ایک بجے کی ان کی فلائٹ تھی۔ جانے سے پہلے انہوں نے پھر اسے نصیحتیں کیں تو وہ دل ہی دل میں بولی۔

"تائی اماں! کچھ نصیحتیں بیٹے کو بھی کر دیں۔ اتنی خونخوار نظروں سے گھورتا ہے۔" ان کے جانے کے بعد وہ اور شازم بالکل تنہا رہ گئے۔ اشفا نے شازم کو زبردستی کھانا کھلا کر سلایا اور خود برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔

یہ وہی گھر تھا' جہاں اسے ہر وقت گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ مرتضیٰ کے التفات' اس کی توجہ کے باوجود وہ ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی اور اب وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس کی سوچوں کا محور اب مرتضیٰ کی ذات تھی۔ یہ گھر تھا۔ اسے ہر وقت مرتضیٰ کی یہاں موجودگی کا احساس ہوتا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی' جب مہوش چلی آئی۔

"تم......" اشفا کوئی سخت لفظ بولنے سے پہلے لب بھینچ کر خاموش ہو گئی۔

"اشفا! تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"میں تم سے ناراض نہیں' بس شاک کی کیفیت میں ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گی۔" اشفا نے اسے اس کا تحقیر آمیز رویہ یاد دلایا تو وہ سر جھکا کر بولی۔

"میں معذرت کرتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری معذرت سے کچھ لینا دینا نہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ شازم کو میرے پاس بھجوا دو گی' مگر تم نے مجھ سے تمام رابطے توڑ لئے۔" وہ تنفر سے بولی

"تم اپنی تمام تر بے عزتی بھلائے واپس کیسے آ گئی ہو؟" مہوش نے حیرانی سے پوچھا تو وہ پھٹ پڑی۔

"تم تو چاہتی تھیں کہ میں کبھی نہ آؤں۔ تمہیں کیا پتا مہوش کہ ممتا کیا چیز ہے۔ میں نے اپنی انا' خود داری اور عزت نفس کو اپنی ممتا پر قربان کر دیا ہے۔"

"مرتضیٰ تم سے بے حد متنفر ہے۔ تم نے اس کی انا پر بڑی گہری چوٹ لگائی ہے۔" مہوش نے طنزاً کہا۔

"تم جو چاہتی تھی وہ تو ہو چکا۔"

''بڑی جلدی سمجھ چکی ہو' مرتضیٰ تو اب تمہاری طرف کبھی بھی نہیں پلٹے گا۔ ویسے بھی عطیہ چاچی نے جس طرح مرتضیٰ کے پیر پکڑ کر اسے تم سے شادی کیلئے منایا تھا' اس حقیقت سے تو تم نگاہ نہیں چرا سکتیں۔ کتنی تکلیف دہ یہ بات ہے کہ تم ان چاہی ہو۔'' مہوش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''بہت گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔''

''کیا ادھر تمہارے کسی عاشق نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے' جو واپس لوٹ آئی ہو۔''

''دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔'' اشفا نے چلا کر کہا۔

''یہ گھر میرے دادا کا ہے۔'' مہوش نے اک جتانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجالی اور بولی ''مرتضیٰ کو دوبارہ اپنی طرف راغب کرنے کیلئے تمہیں نئے سرے سے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔''

''تمہاری اور مرتضیٰ کی وہ محبت کہاں گئی' جس کی تم نے مجھے داستان سنائی تھی۔'' اشفا نے تلخی سے کہا تو وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی۔

''وہ محبت تو آج بھی ہمارے درمیان ہے۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ میں اگر چلی جاؤں تو تم مرتضیٰ کو پالوگی۔ پھر ایسا کیوں نہ ہوا۔''

''میں نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔'' مہوش قدرے گڑبڑائی۔

''اونہہ...... اس نے تمہیں خود ہی منہ نہیں لگایا۔'' اشفا نے تنفر سے سر جھٹکا اور اٹھ کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

تائی اماں کی نصیحتوں کا اثر تھا' اسی لئے مرتضیٰ رات کو ان کی تنہائی کے خیال سے گھر آ جاتا تھا' مگر شازم کو سلانے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اشفا اس کے کٹھور پن پر سلگتی رہتی۔ رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کے سر میں اکثر درد رہنے لگا تھا۔

مرتضیٰ نے اسے اذیت دینے کا نیا طریقہ سوچا تھا۔ اس نے گھر کے تمام ملازمین کو چھٹی کروا دی۔ صرف مکرم جان تھا جس کی مہینے بھر کا راشن لانے کی ذمے داری تھی۔ ہفتے بعد وہ ضرورت کی چیزیں لا دیتا۔ اشفا کو سارے کام خود کرنا پڑتے تھے۔ کچن کے کاموں سے تو اس کی جان جاتی تھی' اوپر سے اتنے بڑے گھر کی تنہائی صفائی کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اسے غصہ اس وقت آتا جب مرتضیٰ کے مہمان ڈیرے پر آتے اور گھر سے کھانا تیار کر کے بھیجنا پڑتا۔ مرتضیٰ کو بھی اس کے پھوہڑ پن کی اب خبر ہوئی تھی۔

وہ صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلتا تھا اور رات دیر سے اس کی واپسی ہوتی۔ کھانا وہ ہمیشہ گھر آ کر ہی کھاتا اور باتیں بنانے کا بھی اسے موقع مل جاتا تھا۔

''کتنی بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت ہو تم۔ کبھی اپنے کمرے کی حالت جا کر دیکھو' اس قدرے بے ترتیبی

ہے' فرنیچر پر مٹی کی تہیں جم گئی ہیں۔ ابھی تو تین دن نہیں ہوئے اماں کو گئے ہوئے اور گھر کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ شازم کے کپڑے صوفے' قالین اور بیڈ کے اوپر بکھرے پڑے ہیں اور خود وہ اتنا گندا ہو رہا ہے۔ تم نے اسے نہلایا بھی نہیں۔"

"ابھی تو اسے کپڑے پہنائے ہیں۔ صحن میں جا کر گندے کر لیتا ہے۔" بڑے بڑے پتیلے دھوتی اشفا نے روہانسی آواز میں کہا۔

"صحن میں نہ جانے کب سے جھاڑو نہیں لگا۔ جامن اور آم کے پتوں کا الگ ڈھیر لگا ہے۔" وہ ناگواری سے بولے جا رہا تھا۔

"برتن دھو کر صحن کی صفائی کرتی ہوں۔" اشفا نے مری آواز میں کہا۔

"برآمدہ بھی صاف کرو۔" ایک نیا آرڈر مل چکا تھا۔ وہ جلتی کلستی جھاڑو اٹھا کر صحن صاف کرنے لگی۔ کچے صحن سے اٹھنے والی دھول نے منٹوں میں ہی اسے کارٹون بنا دیا تھا۔ اوپر سے شدید کھانسی نے پل بھر میں ہی اسے بے حال کر دیا۔

"اتنا نہیں ہو سکا' کم از کم صحن میں ٹائلیں ہی لگوا دیں۔" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"مما! بھوک لگی ہے۔ چپس بنا کر دیں۔" شازم نے جالی والے دروازے سے جھانک کر دہائی دی تو وہ نرمی سے بولی۔

"او کے بیٹا! یہ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"مما! آپ نے پاؤڈر لگایا ہے کیا؟" تھکن سے نڈھال جب وہ کمرے میں آئی تو شازم نے حیرت سے پوچھا۔ اشفا چہرے پر ہاتھ پھیر کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ پاؤڈر اس نے پلکوں اور بالوں میں بھی جذب ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔

جب باہر آئی تو حالت قدرے بہتر محسوس ہوئی' اس نے مرتضٰی کو نہ پا کر شازم سے پوچھا۔ "تمہارے پاپا بول بول کر سارا نزلہ گرا کر کہاں چلے گئے ہیں۔"

"بابا کو فلو ہو گیا ہے؟" شازم نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا' تو اشفا مسکرائی اور بولی۔ "آؤ میں اپنے بیٹے کو چپس بنا کر دوں۔"

"او کے......" وہ اس کے ساتھ ہی کچن میں آ گیا۔ اشفا نے آلو کاٹ کر کڑاہی میں تیل ڈالا۔ بیس منٹ بعد چپس تیار تھے۔ ایک پیالی میں اسے کیچپ ڈالی اور گلاس میں پیپسی اور برف کے کیوبز ڈال کر وہ مختصر سا لنچ شازم کے سامنے رکھے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

"مما! آپ بس چپس اچھے بناتی ہیں۔"

"اور کوئی بھی چیز آپ کو مما کے ہاتھ کی پسند نہیں آتی۔"

"نائیں......" اس نے سچائی سے جواب دیا تو اشفا نے مصنوعی خفگی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''مما ٹرائفل تو اچھا بناتی ہیں۔''

''ہاں اور باقی سب گندا ہے۔'' وہ مزے سے پیپسی کے سپ لے رہا تھا۔ اشفا نے منہ بنا ل
بولی۔ ''ہونا کٹھور باپ کے کٹھور بیٹے' اتنی محنت کرتی ہوں اور تم باپ' بیٹے کو کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ اتنے نخ
ہیں تم دونوں کے۔''

''دادو سب اچھا بناتی ہیں اور پھوپھو بھی۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ دروازے سے اندر آتے مر
نے ان ماں' بیٹے کی کچھ تکرار سن لی تھی' تاہم وہ تاثر دیئے بغیر بولا۔
''کھانا تیار ہے تو دو...... مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''
اشفا سرعت سے اٹھی اور رات کا بچا ہوا سالن اور روٹی بنا کر اس کے سامنے رکھی۔ ''یہ کیا ہے؟''
''یہ چکن کا سالن ہے۔ وہ اصل میں غلطی سے میں نے چکن کو پریشر ککر میں ڈال دیا تھا' تو یہ ہڈیا
الگ ہوگئی ہیں اور گوشت الگ۔''

''یہ تو بہت ہی فخریہ کارنامہ سرانجام دیا ہے آپ نے۔'' مرتضٰی نے بے دلی سے کھانا شروع کیا۔
''اتنا بھی مل جاتا ہے اسی پر اکتفا کریں۔''
''ہاں' تم سے کچھ بعید نہیں کہ فاقے ہی کروانے شروع کر دیتیں۔''
''خود ہی تو کہہ رہے تھے آپ کہ میں روزانہ آلو بناتی ہوں۔ اب رات کو چکن بنایا ہے تو آپ گھ
نہیں آئے اور سامنے رکھا ہے تو باتیں بنا رہے ہیں۔'' وہ خفگی بھرے لہجے بولی۔
''شازم! اس چکن کی تم ہی تعریف کر سکتے ہو۔ آفٹر آل یہ تمہاری ماں ہے اور تمہیں یہ پیاری بھی
بہت ہے۔'' مرتضٰی نے پیپسی کے خالی گلاس میں چپس ڈالتے شازم کو مخاطب کیا۔ اشفا تو صرف اسی بات پر ہی
کھل اٹھی تھی کہ مرتضٰی نے اسے طلب کیا ہے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں بھی وہ ضرورت کے وقت اسے آواز
دے لیتا تھا' مگر یہ وہ نہیں جانتی تھی کہ مرتضٰی نے سچ مچ اسے اپنی ''ضرورت'' ہی سمجھ لیا ہے۔ وہ اشفا جس سے
اسے محبت تھی' وہ کہیں کھوگئی تھی۔ اب وہ صرف شازم کی ماں اور مرتضٰی کی ''ضرورت'' تھی۔
اس نے بہت واضح لفظوں میں اشفا کو اس کی ''اوقات'' یاد دلا دی تھی۔ اشفا کو نظر سے گری اور دل
سے اتری عورت کے مفہوم کی بھی اب سمجھ آئی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ تایا ابا نے ایک مرتبہ پھر مرتضٰی کو اشفا
کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کیلئے مجبور کر لیا تھا۔ تائی اماں اور تایا ابا کے آنسوؤں نے یقیناً اسے پھر سے زیر کر دیا تھا۔
اس کی ایک غلطی تمام عمر کیلئے پشیمانی بن چکی تھی۔ اسے اس رات بہت رونا آیا' جب مرتضٰی نے اسے
اپنے کمرے میں بلوایا۔

''رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگنے والی عورتوں کی تم نہیں جانتیں کیا سزا ہے۔ مگر میں شازم اور بابا
کی خاطر تمہاری اس سزا کو معاف کیا' مگر تم ساری زندگی بھی میرے دل میں اپنا وہ مقام و احترام بحال نہیں کر
پاؤ گی' جو کبھی میرے دل میں تمہارے لئے موجود تھا۔ اب لائٹ آف کر کے ادھر آ جاؤ۔''

اشفا نے مشکل سے ہی سہی اس تلخ حقیقت کو پی لیا۔ اگر وہ اسے اپنی ان تمام بدگمانیوں' غلط فہمیوں اور مہوش کی چال بازی کے متعلق بتا بھی دیتی تو جو جرم اس سے سرزد ہو گیا تھا اس کی تلافی کیسے ممکن ہوتی۔

وہ رات کی تاریکی میں ایک حاسد عورت کی باتوں میں اور وقتی غصے کی لپیٹ میں آ کر نکل گئی۔ اگر اسے ان نزاکتوں کا پتا ہوتا تو وہ کبھی بھی ایسا نہ کرتی۔ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اور جس معاشرے اور ملک کی وہ رہنے والی تھی' وہاں یہ باتیں معمول کا حصہ تھیں۔

کبھی اولاد ماں' باپ سے جھگڑ کر گھر چھوڑ دیتی۔

کبھی ماں' باپ آپس میں جھگڑ کر اولاد کو چھوڑ دیتے۔

کبھی بیوی' شوہر سے ناراض ہو کر بھاگ جاتی۔

کبھی شوہر' بیوی سے تنگ آ کر غائب ہو جاتا۔

یہ تو اس کی ماں کی تربیت کا اثر تھا جو وہ ہمیشہ مضبوط اور ثابت قدم رہی۔ کیا اس کا شوہر کبھی اس کی بات پر یقین کرے گا کہ وہ شخص ہی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے جس سے اس نے محبت کی۔

مرتضیٰ کے سرد رویے کی وجہ سے ہر وقت افسردہ سی رہنے لگی تھی۔ اگرچہ روزانہ ہی ثانیہ اور نمرہ سے فون پر بات ہوتی تھی اور کئی مرتبہ تو تایا ابا سے بھی مرتضیٰ نے بھی کروا دی تھی' مگر پھر بھی وہ سب گھر والوں کو بہت مس کر رہی تھی۔ اس کے بار بار کے اصرار پر ثانیہ نے آنے کی ہامی بھر لی۔ ہفتے کی شام عاشر اپنے دونوں بیٹوں کو اور ثانیہ کو چھوڑ گیا تھا' جاتے جاتے اس نے کتنی ہی مرتبہ دہائی دی تھی۔

''دل پر پتھر رکھ کے چھوڑ کے جا رہا ہوں' صرف اور صرف آپ کی خاصر بھابھی۔''

''اس احسان عظیم کا شکریہ۔'' اشفا اس کے مسخرے پن پر مسکراتی رہی' کہیں سے بھی تو دو بچوں کا باپ نہیں لگ رہا تھا۔

ثانیہ کے آ جانے سے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ بچوں کے ساتھ شازم کا بھی خوب دل لگ گیا۔ سارا سارا دن وہ تینوں آپس میں کھیلتے رہتے۔ شازم اب ضد بھی نہیں کرتا تھا۔ رات کو جب اشفا اس کیلئے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو اس نے بڑے آرام سے پوا گلاس خالی کر دیا۔

''مما! ایک بات بولوں۔''

''جان مما! ایک نہیں ڈھیر ساری باتیں بولو۔'' اشفا نے اس کے سرخ رخسار چوم کر کہا۔

''مما! شازم اکیلا کیوں ہے؟''

''شازم اکیلا کیسے ہے۔ شازم کے پاس مما ہیں بابا ہیں۔'' اشفا قدرے چونک سی گئی تھی۔

''نا ئیں......'' اس نے غصے سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ ''شازم کو بے بی چاہئے' نومی جیسا۔''

''شازم......'' اشفا کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔ اندر آتے مرتضیٰ نے بھی ٹھٹک کر منہ بسورتے اپنے لاڈلے کی طرف دیکھا۔ جس کی فرمائشیں دن بہ دن مشکل سے مشکل ترین ہوتی جا رہی تھیں۔
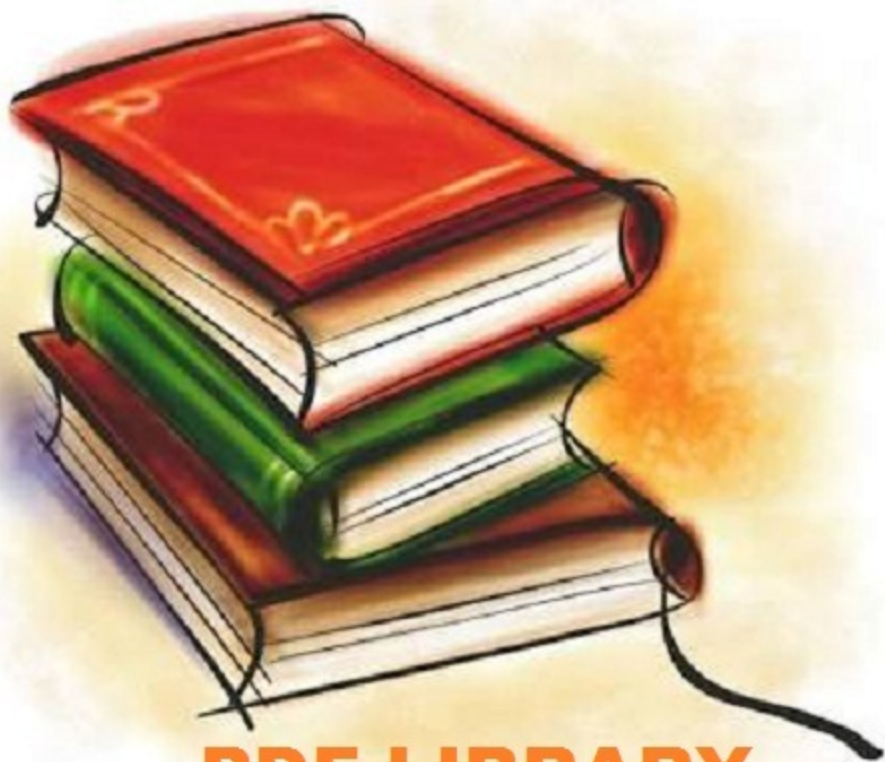
''مما! شازم کس کے ساتھ کھیلے۔'' وہ ٹھنکا۔

''اتنے تو کھلونے ہیں آپ کے' بابا کے ساتھ جا کر اور لے آنا۔'' اشفا نے مرتضیٰ کو دیکھ کر اسے بہلانا چاہا۔

''شازم کو کھلونے نہیں لینے' بے بی لینا ہے۔''

''او کے' میری جان بے بی بھی لا دیں گے۔''

مرتضیٰ نے اسے گود میں اٹھا کر بھینچ لیا تو اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا۔

☆☆☆

''لالا! جب تک اماں اور بابا نہیں آتے' آپ ہمیں اور بچوں کو کہیں گھما' پھرا لائیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ مری چلتے ہیں۔'' ثانیہ نے بڑے دلار سے فرمائش کی تھی۔ مرتضیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

ثانیہ نے نمرہ اور عامر سے بھی بات کی تھی' مگر عامر کو چھٹی نہ مل سکی' البتہ عاشر اسی شام آ گیا تھا۔

اگلی صبح بہت سویرے انہیں گھر سے نکلنا تھا۔ اشفا اور ثانیہ نے مل کر تمام تیاری مکمل کر لی تھی۔ بچے بے حد خوش تھے' اسی خوشی کے عالم میں کچی نیند سے اٹھائے جانے پر بھی نہ روئے۔ پہلا قیام ان کا اسلام آباد میں تھا۔ تقریباً تین دن وہ اسلام آباد ٹھہرے تھے۔ دامن کوہ' فیصل مسجد' راول ڈیم اور مرتضیٰ کے کزن کی فیملی سے ملنے کے بعد وہ مری کی طرف عازم سفر ہو گئے تھے۔

مری کے ایک قدرے مناسب ہوٹل میں مرتضیٰ نے پہلے سے ہی بکنگ کروا لی تھی۔ شازم' حنان اور نومی بے حد مسرور تھے۔ بھوربن اور نتھیا گلی سے ہوتے ہوئے مال روڈ اور پھر عاشر کے اصرار پر وہ گھر واپسی کے بجائے کاغان کی طرف نکل گئے۔

یہاں کے فلک بوس پہاڑ' سرسبز وادیاں' گیت گاتی' شور مچاتی' گنگناتی ندیاں' طویل وعریض سبزہ زار' خوشنما جھیلیں' تیز وتند جلالی دریا' فطرت کے دیوانوں اور شیدائیوں کیلئے ایک بہت بڑا اثاثہ اور قدرت کا انمول اور بیش بہا تحفہ ہے۔

اشفا نے پورے سفر کے دوران ایک بات نوٹ کی تھی کہ ثانیہ اور عاشر کے درمیان کسی قدر بے تکلفی تھی۔ پورے سفر میں عاشر کی چھیڑ چھاڑ اور ثانیہ کا شرمانا' مسکرانا کس قدر اپنائیت ومحبت تھی دونوں کے درمیان۔

کاغان میں ان دنوں بہت رش تھا۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح اور فطری حسن کے دیوانے نہ جانے کہاں کہاں سے ان دلکش نظاروں کو دیکھنے کیلئے آئے تھے۔

دوران سفر ہی بچے اور وہ دونوں خواتین تھک چکی تھیں' لہٰذا ہوٹل پہنچتے ہی شازم سونے کیلئے مچلنے لگا۔ ثانیہ بھی بچوں کو سلانے اور خود آرام کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سامان رکھنے کے بعد عاشر اور مرتضیٰ دونوں کہیں نکل گئے تھے۔ البتہ وہ اور شازم دونوں ہی بہت دیر تک سوتے رہے۔

اشفا کی آنکھ مرتضیٰ کے جھنجوڑنے پر کھلی تھی۔ وہ انتہائی غصیلے تاثرات لئے اسے گھور رہا تھا۔

''میرے کپڑے کہاں ہیں؟''

''وہ بلیک سوٹ کیس میں ہیں۔''

''اس میں تو تم نے جرسیاں' سوئیٹر اور شالیں بھر لی ہیں۔ بے وقوف' احمق عورت کیا یہ گرم کپڑے پہننے کا موسم ہے۔''

''میں سمجھی مری میں ٹھنڈ ہوگی۔'' وہ اپنی شرمندگی چھپانے کی غرض سے کمبل میں منہ چھپانے لگی تو مرتضٰی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر سے کمبل کھینچا۔

''اگر کسی سے مشورہ لے لیا جائے تو بے وقت کی شرمندگی اور خجالت سے بچا جا سکتا ہے۔'' وہ بہت بھنا کر پلٹا تو اشفا پیچھے سے بولی۔

''آپ کے کپڑے شاید لیدر کے بیگ میں ہیں۔ آپ رکیں میں نکال دیتی ہوں۔''

''شکریہ' آپ زحمت نہ کریں اور ہاں شازم کو جگاؤ' کچھ کھا پی لے...... اور اب پوستیوں کی طرح دوبارہ مت سو جانا۔ خوامخواہ میرا اتنا خرچ بھی کروایا ہے۔ اگر سونا ہی تھا تو گھر میں ہی رہ لیتیں۔''

''توبہ میری تین' چار گھنٹوں کی نیند پر کیسے مشتعل ہو رہے ہیں' میرا سونا تو انہیں کسی بھی صورت گوارا نہیں۔ اتنی باتیں سنا دی ہیں۔'' مرتضٰی کے جانے کے بعد وہ جلتی کلستی اٹھ بیٹھی۔ شازم کو جگا کر ہاتھ منہ دھلوایا' کپڑے پہنائے' کچھ ہی دیر بعد ثانیہ بھی بچوں کو تیار کر کے لے آئی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ دونوں بھی بچوں سمیت نیچے آ گئیں۔

مرتضٰی اور عاشر انہی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر مرتضٰی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چونکہ رات کافی ہو چکی تھی اور پیٹ میں بھی چوہوں کا میچ شروع تھا' لہٰذا پہلے پیٹ پوجا کرنے کا سوچا۔

عاشر نے اپنی فیورٹ ڈشز یعنی کہ سنگھاڑا مچھلی اور پہاڑی مرچ کلاں اور قیمے کے سالن کا آرڈر دیا۔

ثانیہ اور اس کے لالا کی پسند ایک سی تھی۔ انہوں نے کابلی چنے کا پلاؤ اور تندوری مرغی منگوائی' جبکہ اشفا نے ان تینوں کی پسند سے ہی پیٹ بھرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اف سالن میں کس قدر مرچیں ہیں۔'' ثانیہ نے سوں سوں کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''توبہ' یہ سالن منگوانے کی کیا ضرورت تھی۔'' ثانیہ نے ناک چڑھائی۔

''تم اپنے کابلی چنے کا پلاؤ کھاؤ' میرے مرچوں والے سالن کو نظر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عاشر نے جذباتی پن سے ڈونگا ثانیہ کے سامنے اٹھا لیا۔

عاشر اور ثانیہ کی مزے دار نوک جھوک کے دوران کھانے سے بھرپور انصاف کیا گیا تھا۔ اگلے تین دن مرتضٰی اور عاشر نے انہیں کاغان کا چپا چپا دکھا ڈالا اور حد سے زیادہ تھکایا۔ ان تین دنوں میں وہ صرف رات کو ہی سوتی تھیں اور سارا دن بچوں سمیت ان دونوں کے احکامات پر عمل کرتیں۔

''سیر و تفریح کا شوق پورا ہوا ہے کہ نہیں۔'' مرتضٰی' ثانیہ کو مسلسل چھیڑ رہا تھا۔ ایک ہفتہ کاغان میں رہنے کے بعد اب وہ مزید کہیں اور جانے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ لہٰذا ان پر ترس کھا کر مرتضٰی نے واپسی کا ارادہ کر

لیا۔ جس رات وہ لوگ گھر پہنچے' اسی رات تین بجے فون کی بیل گونج اٹھی۔ فون مرتضیٰ نے ہی سنا تھا اور کاش کہ وہ کبھی یہ فون سنتا ہی نہیں۔ یہ فون ان کیلئے قیامت کی خبر لایا تھا۔

مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے تایا ابا اور ان کا پورا گروپ جس بس میں سوار تھا وہ بس حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ ان کے گھر کے چاروں بزرگوں نے مدینہ طیبہ میں ہمیشہ کیلئے آنکھیں موندلیں اور مدینہ طیبہ کی مٹی ان کا نصیب ٹھہری۔ وہ خوش قسمت تھے جنہیں اللہ نے اپنے نگر بلایا اور پھر تا قیامت اپنے گھر میں ہی ان کا مدفن بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان چاروں عاشقوں کی نہ جانے کون سی ادا پسند آئی تھی کہ ان سب کی ہی دلی خواہش کو پورا فرما دیا۔

اسے دادی کی وہ دعائیں یاد آئیں۔ جو وہ ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتی تھیں۔

''مولا! اپنے گھر بلانا' اپنے در پر بلانا اور پھر واپس کبھی نہ آنے دینا۔''

ان سب کیلئے یہ صدمے بہت عظیم تھا۔ اشفا تو پہلے ہی اپنے والدین کی دائمی جدائی کا دکھ دیکھ چکی تھی' سو ان سب کو حوصلہ دیتے۔ سنبھالتے ہوئے کبھی کبھی اس کے اپنے حوصلے بھی بکھر جاتے۔ مرتضیٰ خود بکھرا ہوا تھا' بہنوں کو کیا حوصلہ دیتا۔ عامر اور عاشر کی اپنی حالت بہت بری تھی۔ ان کیلئے تو ماں ہی سب کچھ تھی۔ انہیں ماں نے ہی سب رشتوں کا پیار دیا تھا' اسی لئے تو انہیں کبھی باپ کی یاد نہیں آئی تھی۔ سائرہ اور ثمن بھی غم سے نڈھال تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو کیا دلاسا دیتے۔

سب سے بڑا صدمہ تو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیاروں کا آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ دنیا داری کے تقاضوں کے تحت انہوں نے وہ تمام رسومات پوری کیں جو کہ اس معاشرے کا حصہ بن چکی تھیں۔ چالیسویں تک لوگ افسوس کرتے اور تعزیت کیلئے آتے رہے۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔

ابھی یہ صدمہ تازہ ہی تھا کہ نقی اور تقی نے زمین میں اپنا حصہ الگ کرنے کا شوشا چھوڑ دیا۔ ان دونوں کو مرتضیٰ کی تکلیف کا احساس بھی کیسے ہوتا۔ شروع سے ہی چاچی نے بچوں کے ذہنوں کو ان کے خلاف بھڑکا کر آلودہ کر دیا تھا اور مرتضیٰ تو چاچی سے اس دن سے متنفر تھا جب وہ اس گھر میں آئی تھیں۔ ہر وقت اماں کے کان میں گھسی مرتضیٰ کے خلاف انہیں اکساتی رہتیں۔

''آپا! بھلا سوتیلی مائیں بھی اتنا خیال رکھتی ہیں۔ آپ نے تو اس فتنے کو سر چڑھا رکھا ہے۔'' یا پھر کہتیں ''کیا ضرورت ہے اسے اچھے اسکولوں میں پڑھانے کی' خوامخواہ اتنا خرچہ.....''

وہ نہ مرتضیٰ کو اچھی لگتی تھی نہ انہیں مرتضیٰ سے کوئی دلچسپی تھی۔ یہ دشمنی اس کی نوجوانی کی عمر تک جاری رہی اور پھر خود بخود چاچی کا رویہ اس سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ مرتضیٰ نے عاشر اور عامر سے مشورہ کر کے جوان کا جائز حق تھا انہیں دے دیا' مگر اس کے باوجود بھی انہوں نے اس پر مقدمہ دائر کروا دیا تھا۔ وہ مزید زمین اس سے مانگ رہے تھے' جسے دینے کیلئے مرتضیٰ نے انکار کر دیا۔

''جو قانونی حق ان کا بنتا تھا وہ میں دے چکا ہوں۔ مزید ایک ٹکڑا زمین کا نہیں دوں گا۔'' ثانیہ اور نمرہ جھگڑا بڑھ جانے کے خوف سے بھائی کو رضامند کر رہی تھیں کہ وہ لوگ جو مانگتے ہیں دے دے' مگر مرتضیٰ کسی طور

نہیں مان رہا تھا۔

''اگر آپ زمین نہیں دینا چاہتے تو نہ دیں' بدلے میں رقم دے دیں۔ میرے پاس پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم......''

''شٹ اپ اشفا!'' مرتضٰی اس زور سے دھاڑا کہ وہ تینوں ہی سہم گئیں۔

''تمہیں ان معاملات میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے میں نبٹالوں گا۔''

''لالا! آپ کو پتا تو ہے کہ وہ شروع سے ہی لالچی ہیں۔ آپ ان لالچیوں کے متھے زمین مار دیں۔''

ثانیہ سمجھانے والے انداز میں بولی تو مرتضٰی غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔

نمرہ اور ثانیہ پچھلے دو ماہ سے ادھر ہی تھیں۔ آج ان دونوں کو ہی جانا تھا۔ ثانیہ' لالا کی وجہ سے فکر مند تھی اور نمرہ کو کچھ اور بھی فکریں کھائی جا رہی تھیں۔ جاتے ہوئے اس کے کان میں راز داری سے بولی۔

''اب شازم کے بہن یا بھائی کو آ جانا چاہیے۔''

''ہاں' تو اور کیا......'' ثانیہ نے بھی تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ہماری دعائیں جلد قبول ہوں گی۔''

ان دونوں کے جانے کے بعد زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر آ گئی تھی۔ پہلے اسے یہ انتظار تو تھا کہ بہت جلد داوی' تایا ابا آنے والے ہیں وہ دن گن گن کر گزار رہی تھی' مگر اب وہ کس کا انتظار کرتی۔

اب اس نے گھر کو بھی اچھی طرح سنبھالنا سیکھ لیا تھا۔ دن ویسے ہی بے رنگ اور پھیکے سے گزر رہے تھے۔ شازم کے ساتھ دن اچھا مصروف سا گزر جاتا تھا' مگر جب وہ سو جاتا تو پھر اشفا پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ کبھی کبھی وہ حیرت سے سوچتی تھی کہ کیا میں وہی اشفا ہارون ہوں۔

وہ نخرے' وہ ضدیں' لاڈ' غصہ' تلملاہٹیں' خفگیاں' سب اک خواب سا محسوس ہوتا تھا۔ مرتضٰی کا رویہ ویسا ہی تھا کبھی دھوپ' کبھی چھاؤں۔ وہ اس امید پر ہر دن اور ہر رات مطمئن سی رہتی کہ کبھی تو مرتضٰی اس کی چار سال پہلے سرزد ہو جانے والی اس غلطی کو معاف کر دے گا۔

عاشر اور عامر کے اصرار بلکہ ضد پر اس نے نقی اور تقی کو مزید زمین دے دی تھی اور پھر خود اس نے تھوڑی سی زمین بیچ کر لاہور کے قدرے پوش علاقے میں چھوٹا سا مگر خوبصورت گھر لے لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ شہر میں شفٹ ہو گئے تھے اور یہی اتنے عرصے بعد ایک واحد تبدیلی تھی' جس نے اس کے بیٹے اور خود اشفا کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا۔

اگرچہ مرتضٰی روزانہ ہی گاؤں کا چکر لگاتا تھا' اکثر رات بھی وہیں رک جاتا۔ زمینوں کا سارا حساب کتاب اب مکرم جان کے سپرد تھا۔

وہ اپنے گاؤں سے تعلق نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس گاؤں سے اس مٹی سے تو اسے عشق تھا۔ ان لوگوں سے اس کا ایک تعلق تھا' وہ کیونکر ان سے منہ موڑتا۔

یہاں آنے کے بعد ایک اور خوشگوار تبدیلی بلکہ خوشخبری انہیں ملی' جس نے ان سب کے غمزدہ دلوں کو

پھر سے سرشار کر دیا تھا۔

ثانیہ اور نمرہ بہت خوش تھیں۔ خوش تو اشفا بھی بہت تھی۔ بس ایک مرتضٰی ہی تھا جس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اسی طرح وقت کے تھال میں مزید کچھ مہینے اور آن گرے۔

☆☆☆

وہ جب بھی گاؤں آتا تھا' اپنے گھر میں ہی ٹھہرتا۔ آج بھی وہ کافی دیر زمینوں کا چکر لگانے کے بعد گھر آیا تو برابر والے مکان سے بڑی درد بھری آواز سنائی دی۔

اے راجہ حسن دا صدا راج مانے

کدی پھیرا پاول غریباں دے ڈیرے

''ہیں یہ پڑوس میں کون سی مائی میراں آ گئی ہیں۔''

وہ سوچتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

سارے گھر کی تمام لائٹس آن کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ چونکہ سارا دن مصروف گزرا تھا' لٰہذا کافی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ جب وہ بہت تھک جاتا تو پھر نیند بہت مشکل سے آتی۔

وہ جوں ہی بستر پر دراز ہوا تو اماں اور بابا کی یاد آنکھوں کو نم کرنے لگی۔ اس گھر میں کبھی خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ قہقہے' مسکراہٹیں' خوشیاں' پھر آہستہ آہستہ اس گھر میں غموں نے بسیرا کر لیا۔ ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔

نہ جانے کیوں آج پھر زخموں سے گویا ٹانکے ادھڑ رہے تھے۔ بیتا وقت یاد آ رہا تھا۔ زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ یادیں جو ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ کچھ خوشیاں بہت سے غم۔

اماں اور بابا کی جدائی نے اسے اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ کسی کم سن بچے کی طرح خوب دھاڑیں مار مار کر روئے۔

اس کی پیاری ماں جو سوتیلی ہونے کے باوجود اس کیلئے صرف ''ماں'' ہی تھی۔ اگرچہ اماں کی بہن اس کی چاچی انہیں کس قدر اس سے متنفر کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ مگر اماں کے رویے میں کبھی اک پل کیلئے بھی تبدیلی نہیں آئی۔ حتیٰ کہ نمرہ اور ثانیہ کی آمد کے بعد بھی جو اہمیت اس کی تھی اور جو اسے محبت ملتی تھی وہ ہمیشہ اس کی رہی۔

وہ ہاسٹل سے گھر آتا' اماں کے اس کیلئے ڈھیروں مزے دار پکوان اپنے ہاتھ سے بنواتیں اور پھر منتیں کر کر کے کھلاتیں۔

اتنے ڈھیروں کے حساب سے لاڈ پیار کے باوجود وہ بگڑا نہیں تھا' بلکہ اماں اور بابا کی محبتوں نے اسے ڈھیروں اعتماد بخشا۔

وہ جب بھی گھر آتا ثمینہ چاچی کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ نو' دس سال کے بچے سے نہ جانے ان کا

کیا بیر تھا یا پھر یہ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ہر ایک سے تلخ کلامی کرنا' طنز کے تیر برسانا۔ غصے سے گھورتے رہنا اور مرتضیٰ کو تو کبھی کبھی وہ مار پیٹ بھی لیتی تھیں' مختلف بہانوں سے۔ وہ نوجوانی کی عمر کو پہنچا تو چاچی کے رویے میں خود بخود تبدیلی آ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسے ذہانت اور وجاہت سے بہت نوازا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کا اچھا اور دل موہ لینے والا اخلاق تھا جو بھی اس سے ملتا گرویدہ ہی ہو جاتا۔

اسے یاد تھا پہلی مرتبہ کب' کس دن اور کس موقع پر مرتضیٰ اور چاچی کی براہ راست تلخ کلامی ہوئی تھی۔

وہ معمول کے مطابق یونیورسٹی سے گھر آیا تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ ٹریکٹر لے کر زمینوں کی طرف نکل گیا۔ رات جب وہ گھر واپس آیا تو مہوش آئی بیٹھی تھی۔ مرتضیٰ کو زیادہ بولنا اور خصوصاً چاچی کی فیملی کے ساتھ بولنا قطعاً ناپسند تھا۔

یہ اسی رات کی بات ہے جب مہوش اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی۔ مرتضیٰ اپنی ناگواری چھپائے مہوش کی طرف متوجہ ہوا۔

''کوئی کام تھا تو باہر ہی کہہ لیتیں۔''

''سب کے سامنے کہنے والا ''کام'' نہیں ہے۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔

''بولو' کیا کہنا ہے۔''

''اظہار محبت کرنا تھا۔'' مہوش نہایت بے خوفی سے بولی تو وہ چیخ پڑا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''سچ کہہ رہی ہوں۔'' اس کی ڈھٹائی' عروج پر تھی۔ پھر اس نے ایک لو لیٹر اس کی طرف بڑھایا۔ مرتضیٰ نے وہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں پکڑا تھا۔ مہوش وہ خط کرسی پر رکھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مرتضیٰ نے وہ خط اٹھا کر پڑھا تو اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ وہ غصے سے بھناتا ہوا چاچی کے پورشن میں پہنچ گیا۔ مگر چاچی نے الٹا آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ انہوں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور رو رو کر دہائیاں دیں۔

''میری معصوم بیٹی کو اس نے ورغلایا ہے۔''

''ثمینہ! ہوش کر' بغیر سوچے سمجھے میرے بچے پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ایسا ہرگز نہیں۔'' اماں اور دادی دونوں نے ثمینہ کو جلی کٹی سنائیں تو انہوں نے مزید واویلا کرنا شروع کر دیا۔

''ہمیں اپنی تربیت پر فخر ہے۔ میرا میر پتر آج کل کے چھچھورے لڑکوں کی طرح نہیں اور پورا خاندان جانتا ہے کہ ہارون کی بیٹی میرے میر پتر کی بچپن کی منگ ہے۔'' دادی نے گرج کر کہا تو ثمینہ جل بھن گئیں اور مہوش ساکت سی رہ گئی۔

اس واقعے کے بعد مرتضیٰ نے ثمینہ چاچی کو مخاطب کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مگر مہوش نے اپنی گھٹیا حرکتوں کو ترک نہیں کیا تھا۔

وہ جب بھی گھر آتا مہوش پہلے سے موجود ہوتی۔ شعر و شاعری والے کارڈ، خطوط اور گفٹس جو کہ وہ چپکے سے مرتضٰی کے کمرے میں رکھ آتی تھی، پھر انہیں اکٹھا کر کے اس کے منہ پر مارنا مرتضٰی کا کام تھا۔

کچھ وقت مزید بیتا اور اماں اور دادی نے ہارون چچا سے شادی کا تقاضا کرنا شروع کر دیا۔

اشفا ہارون جو کہ اس کی بچپن کی منگیتر تھی، نہ جانے کب، کیسے اور کیونکر اس کے خیالوں پر چھاتی چلی گئی۔ مرتضٰی نے بہت بچپن میں اسے دیکھا تھا۔ اسے تو اب اشفا کے نقوش تک بھول چکے تھے۔ مگر اس کا خیالی پیکر ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ اسے چپکے چپکے چاہنے لگا تھا۔ جب بھی اماں اور دادی اس کا ذکر چھیڑتیں، مرتضٰی کے دل کے تار بج اٹھتے۔

پھر ہارون چچا نے پاکستان آنے کا بتا کر ان کو مسرور کر دیا تھا۔ وہ شادی کے سلسلے میں ہی آنا چاہتے تھے۔ مرتضٰی نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اشفا اس کے ساتھ شادی پر دل سے راضی نہیں ہو گی۔ وہ تو مطمئن تھا۔ سرشار تھا۔ مسرور تھا۔ عطیہ چاچی بار بار اشفا کو خوش رکھنے کا اس سے وعدے لے رہی تھیں۔

''دیکھو مرتضٰی! ہمارے بعد ہماری بیٹی کا تم نے بہت خیال رکھنا ہے۔ اسے کبھی تکلیف مت دینا۔ وہ کچھ ضدی اور ناسمجھ ہے اور ہم سے کچھ کچھ ناراض بھی۔ مگر تم اسے کسی بھی حال میں خود سے الگ نہ کرنا۔'' مرتضٰی نے انہیں ہر طرح سے مطمئن کر دیا۔ مگر خود وہ اشفا کے رویوں پر کئی مرتبہ الجھا تھا۔ اسے غصہ بھی۔ بے تحاشا آتا، مگر خود کنٹرول کر کے اشفا کی تمام تلخ و کڑوی باتوں کو شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتا۔

اس نے اشفا کی ہر خطا کو معاف کرنے کا پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا، مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔ اس کا مان ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی انا کا بت بھی پاش پاش ہو گیا۔ اس کی ہستی کا غرور خاک میں مل گیا۔ دل لہولہو ہو گیا، اس کی بے تحاشا محبت، دیوانگی اس کا منہ چڑاتی رہ گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا کہ میر مرتضٰی اندر سے مر گیا ہے۔ وہ اس رات واقعی مر گیا تھا، جب مہوش جیت کے نشے سے سرشار آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک لئے اس کے کمرے میں بڑے تفاخر سے داخل ہوئی تھی۔

''چلی گئی، تمہاری اشفا چلی گئی۔ کتنے مزے کی بات ہے، میر مرتضٰی کی بیوی اپنے دو ماہ کے بچے کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ نہ جانے کس کے ساتھ، کوئی پرانا عاشق بوائے فرینڈ...... ہا ہا ہا۔'' وہ قہقہے لگا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔

''کہاں منہ چھپاؤ گے مرتضٰی! کتنی بے عزتی کی بات ہے کہ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ گئی، بلکہ تم پر تھوک گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ لڑکی زیادہ دیر تمہارے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ ان عیاش، آوارہ امیرزادیوں کا بھلا کیا بھروسہ، مگر تم پر تو اس کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ واہ مزا آ گیا ہے۔ اسی دن کیلئے تو میں بے قرار تھی، بے چین تھی۔ اب میری روح بھی پرسکون ہو گئی ہے۔'' وہ اسے پتھر کا بت بنا چھوڑ کر چلی گئی۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ مرتضٰی حیدر نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ ہنستا تو وہ پہلے بھی کبھی نہیں تھا، مگر لوگ

کہتے تھے کہ وہ نہ بھی مسکرائے تو اس کی آنکھیں مسکراتی ہیں۔

اس نے خود کو شازم کے وجود میں گم کر لیا۔ اس نے لوگوں کے طعنوں اور طنز بھری گفتگو سے بچنے کی خاطر ہر کسی سے ملنا چھوڑ دیا۔

اس نے محفلوں میں بیٹھنا ترک کر دیا۔

اسے ہجوم سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

اسے زندگی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

اور اسے ''عورت'' سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

اسی لئے تو جب چاچی نے بابا کے پیر آ کر پکڑے کہ وہ مرتضیٰ سے مہوش کی شادی کر دیں تو انہوں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھا۔ پھر مہوش بھی بہت روتی گڑگڑاتی رہی تھی، مگر مرتضیٰ تو واقعی پتھر ہو چکا تھا۔

تنگ آ کر چاچی نے زبردستی مہوش کی شادی کر دی۔ وقت بیتتا گیا۔ موسم بدلتے رہے، خزائیں اور بہاریں آتی جاتی رہیں اور پھر ایک روز وہ پھر سے پورے چھ سال بعد اس کا ضبط آزمانے کیلئے چلی آئی تھی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اشفا کے حسین چہرے کو مسخ کر دے، اسے جان سے مار دے، مگر ایک مرتبہ پھر بابا نے اسے اپنی محبتوں کا واسطہ دے کر روک دیا۔ انہوں نے پھر سے اسے پابند کر دیا۔

''اگر تو نے میری اشفا کے ساتھ زیادتی کی، اسے تکلیف پہنچائی یا کبھی چھوڑنے کی کوشش کی تو مرتضیٰ تیرے بابا کو قبر میں بھی چین نہیں آئے گا۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

وہ بے بس ہو گیا تھا۔ مجبور ہو گیا اور پھر شازم کی ماں سے محبت کو دیکھ کر اسے دل پر صبر کرنا پڑا تھا۔

دستک کی آواز سن کر اس کی سوچوں کو بریک لگے تھے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا تو سامنے مکرم کو کھڑا پایا۔

''یہ صحن میں پڑا تھا میر سائیں! میری نظر پڑی تو اٹھا لایا۔'' مکرم نے ایک سبز لفافے کو اس کی طرف بڑھایا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔''

''سائیں کھانا......'' وہ رکا۔

''طلب نہیں۔'' مرتضیٰ نے منع کر دیا تو وہ اسی مؤدب انداز میں پلٹ گیا۔

''کیا ہے اس میں۔'' مرتضیٰ نے بے دلی سے لفافہ چاک کیا تو بیچ میں سے تین، چار کاغذ نکالے۔

اس نے خط نما اس کاغذ پر نگاہیں جما دیں۔

''تمہیں کیا کہہ کر بلاؤں......کوئی رشتہ تو میں نے خود نہیں چھوڑا۔ چلو اس بحث کو رہنے دیتے ہیں۔

مرتضیٰ جب یہ خط تمہیں ملے گا، میں اور امی یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ آج رات ہم نے اسلام آباد جانا ہے اور پھر وہیں سے تقی کے پاس۔

بہت حسد محسوس ہوتا ہے مجھے تم دونوں کو دیکھ کر' کیا کروں یہ میری فطرت ہے' عادت ہے یا جو بھی سمجھ لو۔

وہ پھر آ گئی ہے تمہاری زندگی میں...... میرے تمام منصوبوں پر پانی پھیر کر' مگر دیکھ لو میرا ایک بھی پلان کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے جو چاہا اور جیسے چاہا' سب میری توقع کے خلاف ہوا۔ میں تو اسے خوب بھڑکا کر' تم سے متنفر کر کے' جھوٹی سچی داستانیں سنا کر بھیجا تھا' مگر وہ پھر بھی آ گئی۔

کتنی توہین میں نے اشفا کی خود کی تھی۔ اسے یہ تک کہا کہ تم ان چاہی ہو' زبردستی مرتضٰی کی زندگی میں شامل کی گئیں۔ تمہاری ماں نے مرتضٰی کے پیر پکڑ کر اسے منایا کہ اس کی بگڑی بیٹی سے شادی کر لو۔ کتنا زہر بھرا تھا میں نے اس کے دل میں اور ذہن میں۔

میں تو مسرور تھی کہ وہ اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گی' مگر وہ پھر بھی آ گئی۔

تم دونوں میری آنکھوں کے سامنے رہو' یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے اتنی مرتبہ ٹھکرایا ہے کہ جب اشفا گئی تو میں تمہیں بے عزت کر کے بہت مسرور ہوتی رہی۔ تم میری توہین کرتے رہے اور میں تمہاری متوقع بے عزتی کا سوچ کر لطف اندوز ہوتی رہی۔

دراصل نفرت مجھے اشفا سے نہیں تم سے ہو گئی تھی' مگر اس نفرت کی لپیٹ میں اشفا بھی آ گئی۔ میں مقدر پر شاکی ہونے والی نہیں' اسی طلاق کا لیبل لگوا لیا ہے۔ اب یہاں ویسے بھی رکھا کیا ہے' اسی لئے میں اور امی نقی کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔

امی بھی تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نقی اور تقی نے اپنے حق سے بھی زیادہ زمین وصول کر لی ہے' شاید تمہارے اسی رویے نے امی کے موڈ کو بھی بدل دیا ہے۔

اب کیا لکھوں کچھ بچا ہی نہیں لکھنے کو' بس اتنی التجا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ' جو اکثر تم نہیں بھلا پاتے۔''

مرتضٰی نے غم و غصے کی ایک تیز لہر من میں اٹھتی محسوس کی۔ جن دو ٹکے کے لوگوں کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت و اہمیت نہیں تھی۔ اشفا انہی لوگوں کے جال میں پھنس گئی اور یہ مہوش کی باتوں میں آئی کیوں؟ براہ راست مجھ سے اس نے کیوں نہ پوچھا' نہ جانے کون کون سی غلط فہمیاں اس نے دل میں پال رکھی ہیں۔

مرتضٰی کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی صبح فجر کے وقت ثانیہ کی چہکتی آواز سنائی دی تھی۔

''لالا! بیٹی ہوئی ہے اور وہ بھی اتنی پیاری کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

مرتضٰی نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا اور اگلا پورا ہفتہ وہ گاؤں ہی میں رہا ادھر اشفا غم سے نڈھال مسلسل رو رہی تھی۔ اسے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا اور اپنی دس دن کی بیٹی پر بھی۔

''اتنی اہمیت ہے تمہاری' باپ نے دیکھنا بھی گوارنہیں کیا۔'' اسے رہ رہ کر وہ وقت یاد آ رہا تھا جب وہ شازم کو گود میں اٹھائے ہسپتال سے آئی تھی اور مرتضیٰ اور عاشر نے پورے صحن میں بھنگڑا ڈالا تھا۔ مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔

مرتضیٰ کتنی محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھا اور شازم کو پیار کرتا رہا اور اب اس نے آنا بھی گوارانہیں کیا۔ ثانیہ اسے سمجھا کر تھک چکی تھی۔

''کوئی ضروری کام ہوگا اسی لئے نہیں آ سکے۔''

''کام ہم لوگوں سے زیادہ اہم ہیں۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔ ثانیہ کو اس لمحے بہت پہلے والی روتی دھوتی' جھگڑا کرتی اشفا کی جھلک دکھائی دی تھی۔

☆☆☆

پندرہ دن بعد مرتضیٰ کی واپسی ہوئی اور وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کی بجائے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اشفا کو پتا چلا تو وہ غصے سے حواس کھو بیٹھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہیں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روئے' مگر دوسرے ہی پل وہ امن کو اٹھائے دھاڑ سے دروازے کھولے مرتضیٰ کے کمرے میں موجود تھی۔

''بہت گناہ گار ہوں میں' بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے مجھ سے' جس کی کوئی معافی نہیں۔ بہت غلطیاں کی ہیں میں نے' کیا اس کی سزا میری بچی کو ملے گی۔

میں جانتی ہوں' میں غلط تھی اور آپ سب کو بھی غلط سمجھتی رہی' میرے نزدیک سارے پاکستانی جھوٹے اور لالچی تھی' جو گرین کارڈ کے لالچ میں شادی کرتے ہیں۔

جب ماما نے آپ کے ساتھ اچانک میری شادی کا فیصلہ کا تو مجھے شاک لگا۔ میں مرینہ جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اسی لئے میں انکار کرتی رہی۔

مجھے دکھ ہوا کہ ماما نے مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔ مجھے آپ سب لوگ بھی دھوکے باز اور بے ایمان محسوس ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ بھی میرے ساتھ وہ ہی کچھ کریں گے جو مرینہ کے ساتھ یاسر نے کیا۔ مگر مجھے بہت عرصے بعد اپنے خیالات اور منفی سوچوں کو بدلنا پڑا تھا۔

سب سے بڑھ کر مہوش کی بے رنگ زندگی اور جو آپ نے اس کے ساتھ محبت کا فراڈ کیا اس چیز نے بھی مجھے کافی دکھ پہنچایا۔ مگر میں اس وجہ سے واپس امریکہ نہیں گئی تھی۔ اصل وجہ تو یہ بھی کہ مما نے مجھے آپ سب کی نظروں نیں حقیر کر ڈالا تھا۔

جب کوئی ماں' باپ خود سے اپنی بیٹی کا رشتہ ڈالتے ہیں تو بے عزت رہ جاتی ہے ان کی بھی اور ان کی بیٹی کی بھی۔ میرے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ میں زبردستی آپ کی زندگی میں شامل کی گئی ہوں۔ ماما نے منت سماجت کر کے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ آپ مجھے قبول کر لیں۔ مجھ سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوتی۔

اب جبکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے آپ کی خاطر خود کو بدل لیا۔ کھانا بنانا سیکھا' گھر کے کام سیکھے۔ آپ کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا اور آپ میری ایک غلطی کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ میں تھک گئی ہوں

مرتضٰی؟ آپ کے تلخ، کڑوے، کٹھور، سرد رویوں اور آپ کی بے اعتنائیوں کا بوجھ سہہ سہہ کر۔ میں ہار گئی ہوں مرتضٰی! میں ہار گئی ہوں۔ کیا آپ اپنی بیٹی کی خاطر بھی مجھے معاف نہیں کر سکتے۔"

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور مرتضٰی کے ہاتھوں کے طوطے، کبوتر سب اڑ گئے۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"پلیز اشفا! چپ کر جاؤ۔"

"نہیں کرتی چپ۔" وہ اور زور زور سے رونے لگی تھی۔

"غصہ مجھے کرنا چاہئے تھا، الٹا خفا تم ہو رہی ہو۔"

"آپ کو کیوں غصہ کرنا چاہئے؟" وہ تنک کر بولی۔

"تم اس چیپ مہوش کی گھٹیا باتوں پر یقین کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنانے چلی تھیں۔ کیا میں تمہارے نزدیک اتنا ہی نا قابل اعتبار تھا۔ کیا تم میرے ساتھ اپنی بدگمانیوں کو شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔ تم نے احمقوں کی طرح میری عزت کو دو کوڑی کیا اور چلتی بنیں اور بے وقوفوں کی شہزادی تمہیں اسی منحوس نے یہ پٹی پڑھائی ہے کہ عطیہ چاچی اور چاچو نے زبردستی مجھے تم سے شادی کرنے پر مجبور کیا تو یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں اتنا بھی نیک نہیں ہوں کہ سب کی باتوں اور بزرگوں کی جذباتی بلیک میلنگ سے متاثر ہو جاؤں اور ایک بات یہ کہ میرا اور تمہارا رشتہ بچپن سے طے تھا۔"

"کیا؟" اشفا نے حیرت سے کہا۔ مرتضٰی اس کی گود میں کسمساتی اپنی بیٹی کو اٹھا کر چومنے کے بعد سہولت سے بیڈ پر لٹا کر پھر سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"تم بہت احمق ہو۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ مرتضٰی نے اس کے کمزور زرد چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کی پیشانی کو چوما تو وہ قدرے دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں میری بے اعتنائی اور سرد رویہ ناگوار لگتا تھا اور قربت بھی تم سہہ نہیں سکتیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسے بانہوں کے گھیرے میں لے چکا تھا۔

"مرتضٰی! کیا کرتے ہیں؟" وہ شرماتے لجاتے دونوں ہاتھوں سے دور ہٹاتے ہوئے بولی تو اس نے اپنے بازوؤں کے حلقے کو مزید تنگ کیا۔ اس پل دروازہ زور سے کھلا اور شازم بھاگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ مرتضٰی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور اشفا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ شازم نے ماں کے بھیگے چہرے کو دیکھ کر باپ کی طرف رخ کیا۔

"مما! آپ کو کس نے ڈانٹا ہے، بابا نے۔"

"ہاں......" اشفا نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"آپ نے شازم کی مما کو کیوں ڈانٹا؟" شازم غصے سے بولا تھا۔ مرتضٰی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"میری مجال ہے جو شازم کی مما کو ڈانت سکوں۔"

''پھر مما کیوں روئی ہیں؟''

''انہیں گڑیا نے مارا ہے۔'' مرتضیٰ نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل پڑا اور بولا۔''مما! بہنا کیسے کاٹ میں سے نکل کر یہاں آئی۔ کیا چل کر آئی ہے۔''

''نہیں بیٹا! یہ دوڑ کر آئی ہے۔''

''ہیں مما......'' اس کی تحیر سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اشفا نے مرتضیٰ کو گھور کر دیکھا۔ اس پل ثانیہ نے بھی کمرے میں جھانکا تھا۔

''اگر غصے کے بادل چھٹ گئے ہیں اور روٹھنے منانے کا بھی سین ہو چکا ہے تو باہر تشریف لے آئیں' نمرہ اور عامر آئے ہیں۔''

ثانیہ کے شگفتہ لہجے میں سرشاری تھی جو کہ لالا اور اشفا کو خوش' مسرور دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ ان دونوں کو ایک ساتھ باہر نکلتا دیکھ کر اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی۔

''پروردگار عالم! میرے لالا کے ہرے بھرے گلشن کو سدا آباد رکھنا' اب کسی حاسد کی نظر ان کی خوشیوں پر نہ پڑے۔ نہ کوئی بدگمانی کی فصیل دلوں میں دوری کا سبب بنے' میرے بھائی کے آنگن میں اسی طرح پھول مہکیں' بہاریں سدا یہیں بسیرا رکھیں۔ خوشیوں کی عمر طویل ہو اور غم ہمیشہ کیلئے راستہ بھول جائیں۔''

''بیگم! کہیں تم مجھے تو نہیں بھول گئیں۔ پچھلے بیس دنوں سے یہیں ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ بس اب گھر چلنے کی کرو۔'' عاشر کی دہائی پر وہ آنسو صاف کرتی سرعت سے باہر نکل گئی تھی۔

کھڑکی میں سے جھانکتا چاند بھی اس پل مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

دھند کے بعد

گھڑی کی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ یک ٹک گولڈن فریم والے کلاک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ دائیں ہاتھ کی پشت سے انہوں نے بھیگی پلکوں کو پونچھا اور پھر سامنے لگے کیلنڈر کی طرف دیکھنے لگے۔

''13 فروری۔'' انہوں نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے قدرے جھک کر سیاہ جلد والی اس ڈائری کو اٹھایا جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے رحاب پھینک گئی تھی۔

''اس عمر رسیدہ ڈائری میں بند سسکتی محبت کی کوئی حیثیت نہیں چاچو! کیسی محبت کی تھی آپ نے کہ سوائے آنسوؤں اور جدائی کے کچھ بھی نہ دیا پشمینہ چچی کو۔ اتنے سالوں بعد آپ کا یہ اعتراف جرم ان کی زندگی کے اٹھائیس سال لوٹا دے گا۔'' رحاب کے ترش لب و لہجے نے ان کے دل میں نشتر چبھو دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں بول پائے تھے۔

''سچ تو یہ ہے کہ آپ نے محبت کی ہی نہیں تھی۔ وقتی پسندیدگی کو محبت کا نام دے کر نا صرف آپ نے خود کو بلکہ پشمینہ چچی کو بھی دھوکا دیا ہے۔'' رحاب نے تلخی سے کہا تھا۔ ان کی یہ بھتیجی بالکل ایسی ہی تھی صاف گو' بااعتماد' قدرے منہ پھٹ اور دلیر' حق بات کہنے میں ذرا بھی جھجکتی......نہیں تھی مگر پھر بھی اس کے کٹیلے الفاظ اور طنزیہ لب و لہجے نے ان کو تکلیف پہنچائی تھی۔ اک درد کی ٹیس سی سینے میں اٹھی تھی جو پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔

''تم کیا جانو رابی کہ کس مجبوری نے میرے قدموں کو زنجیر کر دیا تھا۔'' ڈائری کی پشت پر لکھے سنہری حرفوں سے جگمگاتے ''پشمینہ فراز'' کے الفاظ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اذیت سے سوچا تھا۔ رحاب کی آواز کی بازگشت ابھی کمرے کے در و دیوار سے گونج رہی تھی۔ اس شاندار بیڈروم کی ہر چیز گویا ان پر ہنس رہی تھی۔ ان کا مذاق اڑا رہی تھی۔ انہوں نے لب بھینچ کر پلکوں کو موندا تو دو سرکش آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔

''گستاخی معاف چاچو آج مجھے کہنے دیجئے کہ صرف اور صرف جائیداد سے عاق کر دیئے جانے کے

ڈر نے آپ کو راستہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔'' انہوں نے بایاں بازو دباتے کرب واذیت سے سر پٹخا۔ اسی پل بہت آہستگی کے ساتھ دروازہ کھول کر رحاب چلی آتی تھی۔ پھر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا سر انکے گھٹنے پر رکھ دیا تھا۔ فراز نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ رحاب آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں چاچو' میں نے بہت بدتمیزی کی ہے۔ بہت غلط بولتی رہی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ آپ کو میری کڑوی اور طنزیہ باتوں نے تکلیف پہنچائی ہے۔ پلیز چاچو معاف کر دیں مجھے۔'' رحاب نے روتے ہوئے سر اٹھا کر ان کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے دھیرے سے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ رحاب کے دل میں اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ فراز کے دونوں ہاتھ لبوں سے لگا لئے۔

''چاچو! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ مختصر بولے۔

''چاچو'' اس نے آہستگی سے ان کا ہاتھ دبایا۔

''ہوں......'' فراز نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا۔ رحاب کی آنکھوں میں اک بھرپور عزم کی چمک تھی۔ وہ کچھ چونک سے گئے تھے۔

''میں ایبٹ آباد' گل مینا آنٹی کے پاس جا رہی ہوں۔'' ان کے ہاتھ میں موجود ڈائری کو پکڑ کر اس نے گل مینا کا ایڈریس والا ورق پھاڑا اور مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

''کک......کیا۔'' فراز کے سر پر گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''گل مینا آنٹی آپ کی اور پشمینہ چچی کی مشترکہ فرینڈ تھیں۔ یقیناً وہ جانتی ہوں گی کہ پشمینہ چچی کہاں رہتی ہیں۔'' رحاب تو گویا سب کچھ طے کر چکی تھی۔ فراز تو مہر بہ لب یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

''کل صبح چھ بجے آپ مجھے سی آف کریں گے۔'' اب وہ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹ تھی۔ پھر اس نے ماما کو آواز دے کر پیکنگ کرنے کا آرڈر دیا۔

''یہ سب کیا ہے رابی۔'' فراز نے بے چینی سے قدرے بگڑے لہجے میں کہا تھا۔

''تم کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''وہ ہی جو آپ پچھلے اٹھائیس سالوں سے نہیں کر سکے۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی اور مضبوطی تھی۔ کبھی کبھی رحاب انہیں پشمینہ کی طرح ہی لگتی تھی ویسی ہی نڈر اور بہادر' وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

''سن رہے ہیں آپ کی لاڈو رانی کیا کہہ رہی ہے۔'' وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ماما کی غصیلی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''پروین! جلدی سے کھانا لاؤ۔'' اس نے زوردار ہانک لگائی تھی۔ ماما نے کافی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ رحاب نگاہیں چرا کے پلیٹ پر جھک گئی۔

''ہاں بھئی بیٹے! کہاں جانے کی تیاری ہے۔'' پاپا نے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اس کی طرف رخ کیا تھا۔

''ایبٹ آباد......'' وہ ازلی خود اعتماد سے بولی۔

''کیوں؟'' ماما نے تیوری چڑھا کر پوچھا تھا۔ اس نے چاول ٹونگتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

''بس ایسے ہی گھومنے پھرنے کیلئے' اب چونکہ پڑھائی تو ختم ہو چکی ہے اور جاب ماما کرنے نہیں دیتیں لہٰذا سیاحت کا شوق پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔'' رحاب نے بڑا مضبوط جواز ڈھونڈا تھا۔ ماہا سراہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ رحاب نے اسے گھور کر دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔

''بہت اچھا فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ میں ٹکٹ کنفرم کروا دیتا ہوں اور چھوٹی خالہ سے بات بھی کرتا ہوں۔ آپ ان ہی کے گھر ٹھہریں۔''

''تھینکس پاپا۔'' وہ بے ساختہ ان کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ ماما نے ناگواری سے اس سین کو ملاحظہ کیا تھا۔

''آپ کی یہی حرکتیں تو اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچائے دیتی ہیں۔ بھلا کیا تک تھی اسے اجازت دینے کی۔ میں سوچ رہی تھی کہ انہی دنوں میں اس کے رشتے کی بات چلاؤں اور آپ......'' رحاب کے اٹھتے ہی وہ شوہر سے الجھ پڑی تھیں۔

''آب و ہوا کی تبدیلی صحت کیلئے بہت مفید ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ بھی بیٹی کے ساتھ گھوم پھر آیئے۔ ذرا غصیلے مزاج پر اچھا اثر پڑے گا۔'' مہران صاحب نے مسکراتے ہوئے بیگم کو چھیڑا تھا۔

''آپ بھی نا مہران حد کرتے ہیں۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔

بیڈ روم میں آ کر اس نے چند ایک کتابیں بیگ میں رکھیں۔ سوٹ کیس کھول کر دوبارہ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر لیٹنے ہی لگی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی اور چاچو اندر آ گئے...... رحاب قدرے سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''رابی! تمہارا یہ سفر لاحاصل رہے گا۔ تم نہ جاؤ۔'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ نہایت آزردگی سے بولے تھے۔

''ایک کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولی تھی۔

''ایک ہزار مرتبہ کوشش کر کے دیکھ لو' وہ اپنے ارادوں میں آج بھی مضبوط ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔'' فراز کی آواز میں کچھ کھو دینے کے کانچ چبھ رہے تھے۔ رحاب نے گہرا سانس خارج کیا۔

''میں آپ کی طرح نہیں سوچتی چاچو' اصل میں مرد اور عورت کی سوچ میں بال جتنا باریک فرق ہے اور پشمینہ چچی......''

''تم پشمینہ کو نہیں جانتیں۔ اس نے کہا تھا۔ فراز جس دن تم راستہ بدل کے کسی اور سمت نکل گئے تو پھر پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ تمہیں پشمینہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے گی۔'' رحاب کی بات کاٹ کر وہ چلائے تھے۔

''اس نے اپنے دل کو مار دیا۔ اس نے دل میں بسائی محبت کو مار دیا۔'' فراز زیر لب بڑبڑائے تھے۔

''محبت کبھی نہیں مرتی' ہاں محبت کرنے والے مر جاتے ہیں اور اگر چچی مر گئیں تو......'' اس نے اک تلخ حقیقت کو برہنہ کیا تھا۔ فراز تڑپ کر رہ گئے۔

''رابی! تم نہ جاؤ......'' فراز ایک مرتبہ پھر گڑگڑائے تھے۔

''کیوں نہ جاؤں چاچو! کیا آپ کا دل نہیں کرتا کہ شاہ نور آپ کے سینے سے لگے۔ ان پیاسی آنکھوں کو اس کی دید سے سیراب کر کے اس سلگتے بلکتے دل کو ٹھنڈک نہیں پہنچائیں گے۔'' وہ بیڈ سے اتر کر ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ فراز کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''یہ سزا میں نے خود اپنے لئے تجویز کی ہے کہ اولاد کے ہوتے ہوئے بے اولاد رہوں۔ سلگتا رہوں ان دونوں کی یاد میں' تڑپتا رہوں اور پھر ختم ہو جاؤں۔'' فراز کا دل گویا کرلایا تھا۔

''میں پشمینہ چچی کو وہ سچائی بتاؤں گی جسے تیرہ گھنٹے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی کہ حقیقت کیا ہے اور یہ کہ میرے پیارے چاچو نہ دھوکے باز ہیں' نہ بے وفا' وہ تو صرف اک عہد......'' اس کے حلق میں گولا سا پھنس گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل میں اک طوفان برپا تھا۔ فراز بوجھل دل کے ساتھ پلٹ گئے تھے۔ رحاب نے وہ تمام خطوط اکٹھے کئے جو کہ فراز چاچو نے لکھے تھے مگر پوسٹ نہیں کر سکے۔ ان خطوط میں ایک گل مینا آنٹی کا خط بھی تھا جس میں انہوں نے چاچو کو باپ بن جانے کی خوش خبری بھی سنائی تھی۔

☆☆☆

ایک لگن تھی اک عزم تھا جو کہ اسے ایبٹ آباد کھینچ لایا تھا۔ چھوٹی دادو جو کہ اس کی دادی کی بہن تھیں ان کا پرانا ملازم رحیم اسے لینے آیا تھا۔ دادو اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ اپنے بوڑھے کمزور وجود میں اسے سموئے وہ کتنی ہی دیر روتی رہی تھیں۔ بار بار فراز چاچو کا پوچھتیں۔ کیسی طبیعت ہے اس کی؟ کیا کرتا ہے؟

دادو خود گھٹنوں کے درد کی وجہ سے بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ آنے جانے سے قاصر' سب کا حال احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے اسے فریش ہونے کیلئے بھیج دیا۔ جب تک وہ شاور لے کر آئی دادو کھانا لگوا چکی تھیں۔ لوازمات سے سجی میز کو دیکھ کر وہ قدرے حیران اور خفا بھی ہوئی تھی۔

''دادو! میں اتنا نہیں کھاتی ہوں۔''

''وہ تو تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم کھاتی نہیں بس سونگھتی ہو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے رحاب کیلئے پلیٹ میں بریانی نکالی۔

''یہ کباب تو لو......'' وہ کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں رکھتی جا رہی تھیں۔ رحاب نے جلدی ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ رحیم فریج میں سے سوئٹ ڈش نکال لایا۔

''چلو یہ کھیر تو چکھو' بہت پسند تھی فراز کو کھیر' وہ بھی میرے ہاتھ کی بنی۔''

''کھیر تو انہیں اب بھی پسند ہے مگر شوگر کی وجہ سے کھاتے نہیں۔''

''اتنی سی عمر میں میرے بچے کی جان کو بیماریاں چمٹ گئیں۔'' دادو افسردہ ہوگئی تھیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے فراز کا وجیہ وشکیل سراپا لہرایا تو اک سرد آہ لبوں سے نکلی۔ پانچ سال پہلے وہ اسلام آباد آ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر ان کے دل کو دھچکا لگا تھا زرد رنگت' بے رونق چہرہ آنکھوں کے نیچے حلقے' اسے دیکھ کر کتنی دیر وہ چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی تھیں۔ اب بھی اپنے ہی دھیان میں سر پر دوپٹہ لپیٹتے ہوئے بڑبڑائیں۔

''واہ آپا تمہاری ضد نے بچے کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔'' رحاب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹھٹک کر رکی تھی۔

اگلی صبح وہ دن چڑھے سو کر اٹھی تھی۔ جب وہ نیچے آئی تو دادو تخت پر لیٹی اونگھ رہی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر کچن میں ہونے والی کھٹر پٹر کی آواز سن کر ادھر چلی آئی۔ حلیمہ بی بی اسے دیکھ کر مسکرائیں' سلام جھاڑا اور پھر جھٹ سے میز پر ناشتہ بھی لگا دیا۔

''دادو نے ناشتہ کرلیا ہے۔''

''نہیں جی وہ اس وقت کچھ نہیں کھاتیں۔'' حلیمہ بی بی نے احترام کے ساتھ جواب دیا۔ رحاب چائے کا کپ اٹھا کر لان میں ٹہلنے چلی آئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پرنم ہوا چہرے سے ٹکرائی تو موڈ خود بخود ہی خوشگوار ہوگیا۔ سرسبز وشاداب لان میں چکراتے ہوئے وہ اپنا اگلا لائحہ عمل تیار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

اسے ادھر آئے ہوئے دو دن ہوگئے تھے۔ ماما کا فون سن کر وہ باہر آئی دادو اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

''تم بور تو نہیں ہو رہیں بیٹا۔'' اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے دریافت کیا تھا۔ رحاب نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں رحیم سے کہتی ہوں کہ تمہیں یہاں کی مخصوص جگہوں کی سیر کروا لائے۔''

''ہاں میں بھی کچھ یہی سوچ رہی تھی۔'' رحاب نے دھیرے سے کہا تھا۔ وہ اس وقت سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی تھی۔ اسے گل مینا آنٹی سے ملنا تھا۔ مگر وہ یہاں کے راستوں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس مقصد کیلئے اسے رحیم کا تعاون درکار تھا۔ رحیم سبزی وغیرہ لینے بازار گیا ہوا تھا اور اس کے آنے تک وہ دادو کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔

''دادو کیا فراز چاچو ادھر آپ کے پاس پڑھنے کی غرض سے آئے تھے؟''

''ارے نہیں تو' فراز گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ پر بیٹا ماں کے بغیر رہ سکتا تھا نہ ماں بیٹے کے بغیر۔ آپا کے فون پر فون آنے لگے اور فراز جلد ہی یہاں سے چلا بھی گیا مگر اسے یہ جگہ یہ علاقہ اتنا پسند آیا کہ دسویں کے پیپر دینے کے بعد وہ مستقل یہاں رہنے کیلئے آ گیا اور آپا سے پوچھے بغیر ہی یہاں کالج میں داخلہ بھی لے لیا۔ آپا اتنی خفا ہوئیں۔ اللہ بخشے تمہارے دادا بڑے اچھے حلیم طبع انسان تھے۔ بہت سمجھایا۔ انہوں نے آپا کو مگر آپا کا غصہ نہ اترا۔ فراز کا ادھر دل بھی خوب لگ گیا۔ کچھ عرصے بعد آپا کا غصہ بھی اتر گیا۔ وہ فراز سے ملنے

آتیں تو مہینہ مہینہ بھر میرے گھر رہ کر جاتی تھیں۔ فراز لائق بھی بہت تھا۔ کالج' یونیورسٹی میں ہر سال فرسٹ آتا اور آپا کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ بڑے دونوں بیٹے کاروباری ذہن رکھتے تھے۔ بس فراز ہی پڑھائی کے میدان میں سب سے آگے نکل گیا اور پھر یہیں پر ہی شادی......'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ رحاب کو بے چینی نے گھیر لیا۔

''پھر دادو......''

''آں...... ہاں کچھ نہیں' لگتا ہے رحیم آ گیا ہے۔ تم ایسا کرو کپڑے بدل کر بال بنا آؤ۔'' انہوں نے دانستہ موضوع بدل دیا تھا۔ رحاب بے دلی سے اٹھ کر کمرے میں گئی۔ کپڑے پریس کئے' شاور لیا اور کچھ دیر بعد تیار ہو کر گل مینا آنٹی کے ایڈریس والا کاغذ کا ننھا سا ٹکڑا مٹھی میں دبائے نیچے چلی آئی۔

''دادو! دراصل ادھر میری ایک قریبی سہیلی رہتی ہے۔ اس کے پاپا کا یہاں ٹرانسفر ہوا ہے۔ آج میں اس سے ملنے کیلئے جاؤں گی۔'' دادو کو مختصر بتا کر وہ رحیم خان کے ہمراہ باہر آ گئی تھی۔ اس نے دادو سے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔ گاڑی وسیع صاف شفاف سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ رحاب اردگرد کے دلکش و حسین مناظر سے بے خبر اپنے ہی خیالوں میں الجھی تھی جب رحیم خان نے اسے مخاطب کیا۔

''بی بی صاحب! کہاں جانا ہے۔'' رحاب نے چونک کر رحیم خان کی طرف دیکھا اور پھر بات سمجھتے ہوئے اسے کاغذ پر لکھا ایڈریس بتانے لگی۔

''پتا نہیں میں گل مینا آنٹی سے مل سکوں گی بھی یا نہیں۔ شاید وہ اس جگہ اب نہ رہتی ہوں۔'' تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑی اک چھوٹے مگر سرسبز بیلوں سے ڈھکے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ رحاب دھڑکتے دل کے ساتھ باہر آئی۔ رحیم خان کو کچھ دیر رکنے کا کہہ کر وہ گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔ دروازہ چونکہ کھلا تھا لہٰذا وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئی۔ مختصر سالان عبور کر کے اس نے اندرونی دروازے میں قدم رکھا۔ اسی پل دائیں طرف سے اک ملازمہ ٹائپ لڑکی نمودار ہوئی۔

''اے میم صیب! کس سے ملنا ہے۔'' رحاب کو اندر جھانکتے دیکھ کر وہ حیرانی سے بولی تھی۔

''گل مینا آنٹی ہیں......؟''

''ہاں' بی بی ہے گھر پر مگر سو رہی ہے۔'' رحاب کو بغور دیکھتے ہوئے وہ تیزی سے بولی تھی پھر اسے ساتھ لئے لاؤنج میں آ گئی۔

''آنٹی کب تک اٹھیں گی۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔''

''ام ابھی جگاتی ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔'' اس کے جانے کے بعد رحاب مختصر سے لاؤنج کا جائزہ لینے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہی لڑکی ایک دفعہ پھر بمعہ کولڈ ڈرنک کے نمودار ہوئی۔

''بی بی بس آ رہی ہے۔ تم یہ پیو' اتنے میں ام چائے بناتی ہے۔''

''ارے نہیں چائے وغیرہ کا تکلف مت کرنا۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔'' رحاب کے انکار کرنے پر وہ سر

ہلاتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔ اس پل قدرے بھاری جسامت والی نفیس سی خاتون اندر داخل ہوئی تھیں۔ رحاب احتراماً کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھو بیٹا۔'' اس کے سلام کا جواب شائستگی سے دینے کے بعد انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میں رحاب ہوں آنٹی' اسلام آباد سے آئی ہوں۔'' اس نے تعارف کی رسم نبھائی۔

''معاف کرنا بیٹے! میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے۔'' گل مینا آنٹی شرمندگی سے گویا ہوئی تھیں۔

رحاب دھیرے سے مسکرائی۔

''ہماری یہ پہلی ملاقات ہے۔''

''یقیناً......'' انہوں نے ہنکارا بھرا اور پھر ملازمہ کو آواز دی۔

''پلوشہ! چائے لاؤ۔''

''نہیں آنٹی مجھے چائے وغیرہ نہیں پینی۔ ایک بہت ہی ضروری کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔'' رحاب نے گویا تمہید باندھی تھی۔ گل مینا آنٹی نے بغور اس کے حسین نین نقوش کو دیکھا۔ باتوں لب و لہجے اور حلیے سے وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے پشمینہ فراز اور ان کے بیٹے شاہ نور کا ایڈریس چاہئے۔'' رحاب نے گویا گل مینا کے سر پر دھماکہ کیا تھا۔ ان کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''تم کون ہو اور کس سلسلے میں پشمینہ سے ملنا چاہتی ہو۔'' رحاب نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے کچھ دیر سوچا اور پھر اعتماد سے بولی۔

''میں ان کے شوہر فراز سکندر کی بھتیجی ہوں۔''

''کیا لینے...... آئی ہو یہاں۔'' گل مینا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں سے سختی جھلکنے لگی تھی۔

''مجھے ان کا ایڈریس چاہئے' میں ان سے ملنا چاہتی ہوں' فراز چاچو......''

''مت نام لو اس ذلیل آدمی کا میرے سامنے۔'' گل مینا اس کی بات کاٹ کر چلائی تھیں۔ رحاب لب بھینچ کر خاموش ہوگئی۔

''کیا چاہتا ہے وہ اب' برباد تو کر دیا ہے اس نے پشمینہ کو......''

''چاچو کا کوئی قصور نہیں آنٹی وہ تو......''

''ہاں سارے قصور تو اس معصوم کے تھے' جس نے اس سے محبت کی۔'' گل مینا نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''دیکھو لڑکی! اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں پشمینہ کو تم سے ملوا دوں یا پھر اس کا ایڈریس دے دوں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میری طرف سے معذرت' اب تم جا سکتی ہو۔'' وہ رکھائی سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''پلیز آنٹی آپ میری بات تو سن لیں۔'' رحاب کا لہجہ التجائیہ ہوگیا تھا۔ گل مینا آنٹی سرعت سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں۔ رحاب مٹھیاں بھینچتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''جب تک آپ مجھے پشمینہ چچی کا پتا نہیں دیں گی۔ میں یوں ہی آپ کو ڈسٹرب کرتی رہوں گی آنٹی۔'' وہ سلگتے ہوئے سرعت سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''مل آئی ہو سہیلی سے۔'' اس نے بڑے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا جب دادو نے اسے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔ رحاب کا موڈ چونکہ سخت خراب تھا اسی لئے رکھائی سے جواب دیتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
شام کو جب وہ نیچے آئی تو دادو اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ رحاب بھی ان کے قریب موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

''رات کے کھانے میں حلیمہ کیا پکائے۔'' انہوں نے بہت شفقت سے اس کی پسند دریافت کی تھی۔

''دال چاول۔'' وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

''تمہارے جنت مکانی چھوٹے دادا کو بھی دال چاول بہت پسند تھا۔'' دادو شوہر کی یادیں تازکرنے بیٹھ گئی تھیں۔ رحاب بھی دلچسپی سے سنتی رہی۔ رات تک اس کا موڈ قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ جب وہ سونے لگی تھی تب چاچو کا فون آ گیا۔ ساتھ ہی اسے گل بینا آنٹی کے ساتھ کی گئی تمام باتیں ازسرنو یاد آ گئیں۔

''کب آؤ گی گڑیا' تمہارے بغیر یہ گھر کاٹ کھانے کا دوڑتا ہے۔'' دوسری طرف چاچو بڑی محبت کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

''ابھی تو بالکل بھی نہیں آؤں گی۔ قسم سے چھوٹی دادو اتنی خوش ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ دو چار مہینے رہوں گی ان کے پاس۔''

''ہیں اتنا لمبا پروگرام۔'' چاچو نے مصنوعی حیرانی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''چاچو! دادو اتنا یاد کرتی ہیں آپ کو......'' گزرے تین دنوں کی ہر بات اس نے عادتاً فراز کو بتائی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتے رہے۔

''گل بینا کے گھر گئی تھیں تم......؟'' فون بند کرنے سے پہلے فراز نے اچانک پوچھ لیا تھا۔ وہ اسی سوال سے ہی بچنا چاہ رہی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستگی سے بولی۔ ''نہیں۔'' اور ساتھ ریسیور بھی کریڈل پر ڈال دیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ تیار ہو کر نیچے آئی تو حلیمہ بی کو باورچی خانے میں مصروف پایا۔

''حلیمہ بی! میں ناشتہ نہیں کروں گی اور ہاں دادو کو بتایئے گا کہ میں اپنی اسی سہیلی کے پاس جا رہی ہوں......'' کچن میں جھانک کر اس نے حلیمہ بی کو مخاطب کیا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ رحیم خان سے گاڑی کی چابی لے کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گیٹ پر ہی پلوشہ سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ پلوشہ اسے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔

''میم صاحب! تم......''

''سنو' آنٹی سے کہو کہ رحاب آئی ہے۔'' اس نے پلوشہ کے گھبرائے گھبرائے چہرے کی طرف دیکھ کر سختی سے کہا تھا۔

''وہ تو گھر نہیں ہے۔'' پلوشہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

''جھوٹ مت بولو'' رحاب کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''میم صاحب! تم چلی جاؤ۔ ورنہ بی بی ام کو بہت غصہ ہو گی۔''

''او کے......'' رحاب نے گہرا سانس خارج کیا۔

''ابھی تو میں جا رہی ہوں۔ کل پھر آؤں گی۔ آنٹی کو بتا دینا۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے پلٹی اور سارا غصہ گاڑی پر نکال دیا۔ غصے کی زیادتی کی وجہ سے اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی اسی لئے جب ٹرن لیا تو سامنے سے آتی جیپ دکھائی نہ دی اور نہ ہی سپیڈ کم ہو سکی لہٰذا زوردار ٹکر ہونے کے بعد خود بخود انجن خاموش ہو گیا تھا۔ رحاب کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔ دو مرتبہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اسی پل اس کی گاڑی کا شیشہ بجایا گیا تھا۔ رحاب نے جھنجلا کر دائیں طرف دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے باہر نکلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ رحاب کچھ سوچ کر باہر نکل آئی۔

''روڈ پر نکلنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ مگر آپ جیسے لوگ اندھوں سے بھی بدتر ہیں۔ جس سیٹ پر آپ بیٹھی ہیں اس کے کچھ اپنے تقاضے ہیں جس سے آپ شاید ناواقف ہیں اور نا صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی نقصان کر ڈالتے ہیں۔ میری جیپ اور اپنی گاڑی کا حال دیکھ لیں۔ ورکشاپ میں گئی تو خوامخواہ سات آٹھ ہزار کا خرچہ آ جائے گا۔ آئندہ احتیاط کیجئے گا او کے۔'' مضبوط دبنگ لہجے میں اپنی کہتا اس کی بغیر سنے وہ تیزی سے پلٹ گیا تھا۔ رحاب دانت پیتے ہوئے ایک دفعہ پھر گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کتنی باتیں سنا گیا ہے فضول آدمی......'' وہ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی تھی۔ گھر آئی تو حلیمہ بی نے دادو کی خرابی طبیعت کے بارے میں بتایا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دادو کی کمر میں شدید درد اٹھا تھا اور اب انہیں پسلی میں بھی شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ رحیم خان کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ مختلف ٹیسٹ وغیرہ کروائے۔ تفصیلاً چیک اپ کروانے کے بعد وہ قریبی میڈیکل اسٹور سے دوائیاں لینے گئی تو گل مینا آنٹی کے ساتھ انہی حضرت کو اسٹور سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کی چال بڑی ہموار اور باوقار قسم کی تھی۔ رحاب ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہ وہیں کھڑی رہی۔

''کیا رشتہ ہو سکتا ہے اس کا گل مینا آنٹی کے ساتھ۔''

واپسی پر یہی ایک سوچ ذہن کے دریچے پر دستک دیتی رہی تھی۔

دوسری صبح وہ دادو کی رپورٹس لینے جا رہی تھی کہ ماما کی کال آ گئی۔ اس نے سرعت سے سیل آن کر کے کان سے لگایا۔

''رابی! آ بھی جاؤ بیٹا۔'' دوسری طرف ماما بڑی حلاوت کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

''اف ماما ابھی تو مجھے آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔'' اس کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔

''ماہا تمہیں بہت مس کر رہی ہے۔''

''اسے بھی بھیج دیں۔'' وہ مزے سے بولی تھی۔

''وہ تو پہلے ہی تیار بیٹھی ہے۔'' ماما نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا۔ پھر قدرے راز داری سے بولیں۔

''رابی! دراصل تمہیں دیکھنے کیلئے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ سنڈے تک آ جانا......''

''آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔ میں ابھی نہیں آ سکتی۔'' رحاب نے کچھ سختی سے کہہ کر سیل آف کر دیا تھا۔

دادو کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ پہلے کی طرح ٹھیک ٹھاک باتیں بھی کر رہی تھیں۔ مگر رباب جانتی تھی کہ ان کا دل کس قدر غم زدہ ہے۔ دو بیٹوں کی ماں نوکروں کے رحم و کرم پر تنہا رہنے پر مجبور تھیں۔ دونوں بیٹے عرصہ دراز سے لندن میں مقیم تھے۔ ناصر بھائی کا فون آیا تو رحاب نے اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں وہ جلی کٹی سنائیں کہ بے چارے شرمندگی کے مارے کچھ بول ہی نہیں پائے تھے۔ اس نے دادو کی بیماری کی ایسی تصویر کشی کی تھی کہ ناصر اور عامر بھائی دونوں کے دل اس حد تک پسیج گئے کہ انہوں نے اگلے چند ہفتوں تک وطن آنے کی خوش خبری ماں کو سنا کر انہیں پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ دادو بھی اس کایا پلٹ پر حیران تھیں۔ بار بار رحاب کا منہ سر چومتیں۔ انہوں نے ابھی سے ہی گھر کی از سر نو صفائی کروانا شروع کر دی۔ رحاب انہیں ہشاش بشاش دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔

دوسری شام ماہا بیگم بوریا بستر سمیٹے آ گئی تھیں۔ رحاب کی تیوریاں چڑھ گئیں اسے دیکھ کر۔

''کیا ضرورت تھی آنے کی۔'' رحاب نے بے تکلے پن سے سوال داغا۔ ماہا نے منہ بسور کر پہلے رحاب اور پھر دادو کی طرف دیکھا۔ دادو نے رحاب کو ڈانٹنے کے ساتھ ماہا کو پچکارتے ہوئے ساتھ لگا لیا تھا۔

حلیمہ بی نے ماہا کا بستر بھی اس کے کمرے میں لگا دیا تھا لہٰذا وہ رات دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور پھر لباس بدل کر بالوں میں ہلکا سا برش پھیرنے کے بعد ماہا کو سوتا چھوڑ کر نیچے چلی آئی تھی۔ دراز میں سے گاڑی کی چابی نکال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ آج وہ پختہ ارادہ کر کے نکلی تھی کہ گل مینا آنٹی سے پشمینہ چچی کا اتا پتا لے کر ہی دم لے گی۔ گاڑی سائیڈ پر پارک کر کے اس نے بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دوسرے ہی پل دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی شخصیت نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ رحاب بھی اس اتفاق پر جی بھر کے حیران ہوئی تھی۔

''جی' آپ کو کس سے ملنا ہے......؟'' اسے بت بنا پا کر مقابل نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ استفسار کیا تھا۔

''وہ......گل مینا آنٹی سے......'' رحاب گڑبڑا کر بولی تھی۔

''آنٹی اس وقت سو رہی ہیں۔''

''تو کیا میں چلی جاؤں؟'' اس نے تنک کر پوچھا۔

''آپ کی مرضی ہے چاہے تو چلی جائیں۔ چاہے تو انتظار کر لیں۔'' رحاب نے کچھ پل کیلئے سوچا اور پھر اسے دروازے میں جمے دیکھ کر طنزیہ بولی۔

''آپ سامنے سے ہٹیں گے تو اندر آؤں گی میں۔''

''کیوں نہیں۔'' وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ رحاب اندرونی حصے کی طرف جانے کی بجائے لان میں رکھی سفید پالش شدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ شاید ایکسر سائز کر رہا تھا اسے لان کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ترک کیا اور پھر گیٹ کے پاس پڑے اخبار کو اٹھا کر لان کی طرف آ گیا تھا۔ رحاب بار بار اندرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی بے چینی کو ملاحظہ کیا اور پھر اپنے مخصوص دبنگ لہجے میں بولا۔

''آنٹی کی طبیعت خراب تھی۔ دوا کھا کر سوئی ہیں۔ یقیناً دیر سے اٹھیں گی۔''

''ٹھیک ہے پھر میں ابھی چلتی ہوں۔'' وہ کوفت زدہ لہجے میں کہتے ہوئے اٹھی تھی۔ پتھروں کی سرخ روش پر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے پلوشہ کی آواز سنی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

''شاہ نور لالا' خانم کا فون ہے۔'' پلوشہ کی بلند آواز سنائی دی۔

رحاب نے بے یقینی کے عالم میں مڑ کر دیکھا تھا۔ اسی پل شاہ نور نے بھی اک پل کیلئے رحاب کے چہرے پر پھیلی حیرانی کو بغور پڑھا تھا دوسرے ہی لمحے وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ رحاب کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی تھی۔ پلوشہ اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔

''پلوشہ! یہ کون تھا؟'' رحاب نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''شاہ نور لالا ہیں.....'' پلوشہ سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے بولی تھی۔

''گل مینا آنٹی سے اس کا کیا تعلق ہے۔'' اس نے سرسراتے لہجے میں دوسرا سوال کیا۔ ''بی بی کی سہیلی ہے نا پشمینہ خانم ان کے بیٹے ہیں شاہ نور لالا۔'' پلوشہ نے گویا اس کے سر پہ دھماکا کیا تھا۔ وہ گم صم سی پلوشہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''خانم کہاں ہوتی ہیں؟''

''دادی دیامر کے قریب ''بسری'' گاؤں ہے نا۔ وہ ہی خانم کا گاؤں ہے۔ ام بھی اسی گاؤں کا ہے۔ خانم نے ہی ام کو ادھر ملازمت دلوایا ہے۔'' وہ بڑے شوق اور جوش کے ساتھ اسے بتانے لگی تھی۔

''یہ بتاؤ کہ دیامر جاتے کیسے ہیں۔ میرا مطلب ہے مجھے بسری کا مکمل پتہ بتاؤ۔'' رحاب نے بہت بے صبری کے ساتھ پلوشہ کے ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا تھا۔ وہ پہاڑی لڑکی خوشی خوشی اپنے گاؤں کے متعلق اسے بتانے لگی تھی۔ رحاب نے اس کی بتائی تمام باتیں ذہن نشین کر لی تھیں اور جب وہ یہاں سے نکل کر گھر آ رہی تھی

تو اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔

☆☆☆

وہ گنگناتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلی نظر صوفے پر بیٹھی افسردہ ماہا پر پڑی۔ رحاب اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے ماہا ڈیئر۔ ایسی رونی صورت بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔''

''تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں غمگین بیٹھوں یا پھر اچھلوں کودوں ناچوں گاؤں۔'' وہ گویا انگارے چبا کر بیٹھی تھی۔

''حلیمہ بی اسے صبح صبح کس چیز کا ناشتہ کروایا ہے۔''

کچن سے نمودار ہوتی حلیمہ بی کو دیکھ کر وہ شرارت سے بولی تھی۔ ماہا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر غصے سے بولی۔

''تم اتنے سویرے کہاں گئی تھیں۔''

''اوہو تو اس بات کا غصہ ہے۔'' رحاب نے سوچا اور پھر ماہا کا ہاتھ نرمی سے پکڑا۔

''ابھی تھوڑی دیر بعد میں اپنی پیاری بہن کو زبردست سی شاپنگ کرواؤں گی اور آج کا دن ہم خوب گھوم پھر کر گزاریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ہوں......ٹھیک ہے۔'' وہ روٹھے روٹھے لہجے میں بولی تھی۔

''واہ کیا شاہانہ انداز پائے ہیں۔'' رحاب زیر لب بڑبڑاتی ہوئی دادو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وعدے کے مطابق وہ پورا دن انہوں نے گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ چونکہ ماہا بہت تھک چکی تھی اسی لئے آتے ہی سو بھی گئی جبکہ رحاب بے انتہا تھکن کے وجود بھی پوری رات سو نہیں پائی تھی۔ چاچو کا ویران چہرہ ذہن کا اسکرین پر ابھرتا تو وہ بے چین سی ہو کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ وہ رات بھر جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔

صبح ہوتے ہی رحیم خان نے کسی خاص نمائش لگنے کی اطلاع دی تھی۔ ماہا تو سنتے ساتھ ہی ایکسائیڈ ہو گئی تھی۔ اسی لئے رحاب کو مجبوراً رحیم خان کے ساتھ ماہا کو لے کر نمائش دیکھنے آنا پڑا۔ ماہا بہت پر جوش تھی جبکہ رحاب قدرے بے زاری الگ تھلگ سے کونے میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جب اچانک ہی اک خاص چہرے پر اس کی نگاہ پڑی۔ کچھ سوچ کر وہ سرعت سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

''ہیلو شاہ نور' کیسے ہو۔'' رحاب نے کمال بے تکلفی کے ساتھ اسے مخاطب کیا تھا۔ شاہ نور کی آنکھوں میں اک پل کو تحیر ابھرا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے تھے۔

''تم ابھی تک گئے نہیں۔'' شاہ نور کو مہر بہ لب کھڑا دیکھ کر وہ ایک دفعہ پھر گویا ہوئی تھی۔ اب کے وہ کچھ چونک گیا تھا۔

''کہاں......؟''

''اپنے گھر اور کہاں۔'' وہ ایسے بول رہی تھی گویا کہ برسوں سے اس سے آشنائی ہو۔ شاہ نور بے حد حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میں تو سوچ رہی تھی کہ تم اب تک چلے گئے ہو گے......''

''میرے آنے جانے سے تمہارا کیا واسطہ' مجھے خوامخواہ کی بے تکلفی پسند نہیں۔'' وہ کھردرے لہجے میں کہتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ رحاب لب بھینچتے ہوئے ماہا تک آئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں گھر میں موجود تھیں۔ ماہا کا چہرہ پھولا ہوا تھا جبکہ رحاب لاپروائی سے چینل سرچنگ میں مصروف ہو گئی۔ اس کام سے دل اکتایا تو ریموٹ پھینک کر اپنے کمرے میں گھس گئی جبکہ ماہا گہری سانس خارج کرتے ہوئے دادو کو اپنی شاپنگ دکھانے لگی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ کافی دیر غصے سے ادھر ادھر چکراتی رہی تھی پھر سلگتی کنپٹیاں دباتے ہوئے پلنگ پر ڈھے گئی۔

پلوشہ کے ساتھ مختصر سی دوستی کر کے اس نے شاہ نور کا پرسنل نمبر حاصل کر لیا تھا۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ بہت اطمینان کے ساتھ ماہا کے سو جانے کے بعد شاہ نور کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

''سوری ڈیئر تمہاری ماں تک پہنچنے کیلئے تمہارے قریب آنا بہت ضروری ہے۔'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے سیل کان سے لگایا تھا۔ پانچویں بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ رحاب نے طویل سانس کھینچ کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے اور دوسری طرف موجود شخص کی کڑوی کسیلی باتیں سننے کیلئے خود کو تیار بھی کر لیا۔

''اگر میں نے تمہاری نیند ڈسٹرب کی ہے تو پیشگی معذرت......'' وہ بے حد سکون سے کہہ رہی تھی دوسری طرف شاہ نور کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو؟'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ترش لہجے میں بولا تھا۔ رحاب کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا ہے پوچھنے کا۔'' اس نے طنز کیا۔ دوسری طرف یقیناً وہ سلگ اٹھا تھا۔

''رات کے اس پہر اجنبی مردوں سے گفتگو کرتی لڑکیاں زہر لگتی ہیں مجھے۔ شرم نہیں آتی ایسی چیپ حرکت کرتے ہوئے۔ اگر وقت نہیں گزر رہا تو کسی اور نمبر ڈائل کرو......'' رحاب کے لبوں کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ شدید اہانت کے احساس نے اسے آگ بگولا کر دیا تھا تاہم اس نے اپنے لہجے کی نرمی کو برقرار رکھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا ابھی اس کا دماغ ٹھکانے لگا دے۔

''میں تمہیں اجنبی نہیں سمجھتی۔''

''اوہو......'' اس نے ''اوہو'' کو کافی طویل کھینچا پھر اسی سرد و سپاٹ انداز میں گویا ہوا۔

''ایک دو اتفاقیہ ملاقاتوں سے آپ کون سی رشتہ داری گانٹھ بیٹھی ہیں۔''

''رشتہ بنتے کون سی دیر لگتی ہے۔'' وہ اپنے ازلی منہ پھٹ لہجے میں بے باکی سے کہتی شاہ نور کو سلگا گئی تھی۔ رحاب نے غصے سے سیل آف کر کے صوفے پر پٹخا اور خود بھی لیٹ گئی۔

''تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کیسی ڈھیٹ خاتون سے پالا پڑا ہے۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس

نے پلکیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' رحاب نے کچھ سوچتے ہوئے دوسرے دن ایک دفعہ پھر اس کے موبائل پر کال کی تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے کال ریسیو کر لی تھی ورنہ رحاب تو سوچ رہی تھی وہ نمبر دیکھ کر موبائل آف کر دے گا۔

''مگر میں آپ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتا۔'' وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اگر تم......''

''میں نے کہا نا محترمہ کہ میں آپ کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا ملنا تو دور کی بات ہے۔ آپ غلط بندے پر ٹرائی کر رہی ہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر درشتگی سے بولا تھا۔ رحاب کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔

''بکواس بند کرو......'' وہ پوری شدت سے چلائی تھی۔

''گھٹیا انسان تم نے رحاب سکندر کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ آئندہ اس لہجے میں بات کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گی۔'' زہر خند لہجے میں کہتی وہ شاہ نور کو چونکا گئی تھی۔ اس کا ردعمل بہت شدید تھا۔ موبائل کان سے ہٹا کر وہ کافی دیر اس اجنبی لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ کون تھی وہ؟ کیا چاہتی تھی کس مقصد کے تحت اسے فون کرتی تھی؟ بہت سے سوالیہ نشان اس کی نگاہوں کے سامنے جگمگا رہے تھے۔

اسے بے اختیار رحاب کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات یاد آئی۔ شاہ نور کو وہ کافی باوقار لگی تھی۔ دوسری مرتبہ اس نے رحاب کو گل مینا آنٹی کے گھر دیکھا تھا۔ اس کے لب و لہجہ میں محسوس کیا جانے والا ٹھہراؤ تھا۔ اس کا مضبوط لہجہ اور خود اعتمادی نے شاہ نور کو کافی متاثر کیا تھا مگر کل رات اس کی فون کال سن کر شاہ نور کو اپنی رائے بدلنا پڑی تھی اور آج ایک مرتبہ پھر وہ اپنے اندازے کے غلط ہونے پر حیران تھا۔

''اس لڑکی کو گل مینا آنٹی سے کیا کام تھا۔ کیا مجھے آنٹی کو اس کے متعلق بتانا چاہیئے؟'' وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھا سر تھام کے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لڑکی اس کیلئے اچھا خاصا معمہ بن گئی تھی۔ ''یعنی کہ محترمہ آئندہ بھی بات کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ اچھی زبردستی ہے۔'' اسے چند منٹ پہلے رحاب سے ہونے والی گفتگو یاد آئی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا پیکنگ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

رحاب کے دادا سکندر علی کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے فرقان ان سے چھوٹے مہران اور سب سے چھوٹے فراز۔ فرقان تایا' دادا کے انتقال کے فوراً بعد اپنا بزنس الگ کر کے لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں۔ مہران کی شادی کے تقریباً سات سال بعد رحاب اور اس کے تین سال بعد ماہا پیدا ہوئی تھی۔ دادی نے اگرچہ رحاب کی آمد پر اچھی خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا جبکہ ماہا کی پیدائش پر ان کی ناگواری ڈھکی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ رحاب نے ہوش سنبھالا تو دادی کو ہر کسی سے نالاں ہی پایا۔

تائی جی تو لاہور میں ہوتی تھیں کبھی کبھار ہی ان کا چکر اسلام آباد لگتا تھا جبکہ اس کی ماما چوبیس گھنٹے دادی کے زیر عتاب رہتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا پارہ چڑھ جایا کرتا تھا۔ غصے کے عالم میں برتن توڑتیں۔ چیزیں پٹختیں۔ کسی اور پر بس نہ چلتا تو ماما کی دھنائی ہو جاتی۔ روتی چلاتی ماما کو فراز چاچو ہی دادی کے ظالمانہ چنگل سے چھڑاتے تھے۔ اس کے پاپا تو کام کے سلسلے میں زیادہ تر شہر سے باہر ہی ہوتے تھے جبکہ ماما تو دادی کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا وہ دونوں ہمہ وقت چاچو کی مہربان آغوش میں چھپی رہتیں۔ رحاب اور فراز چاچو کی بنتی بھی خوب تھی۔

وہ اسکول سے آنے کے بعد باقی کا وقت چاچو کے ساتھ گزارتی۔ چاچو ان دونوں کو گھمانے پھرانے لے جاتے تھے اور دادی چاچو کو ان کے لاڈ اٹھاتے دیکھ کر بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ انہیں پوتا نہ ہونے کا شدید قلق تھا۔ جب ڈپریشن بڑھتا تو وہ ناعمہ چچی جو کہ ان کی چچی کے مرتبے پر ابھی فائز نہیں ہوئی تھیں ان کو گالیاں اور کوسنے دیئے جاتے۔ وہ دونوں شعور کی منزل تک پہنچیں تو ماما نے انہیں بتایا کہ دادی نے اپنی بھانجی کے ساتھ چاچو کا رشتہ طے کر رکھا تھا۔ عین بارات والے روز ناعمہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ دادی کا مارے اشتعال اور توہین کے احساس سے برا حال تھا جبکہ فراز نے تو بے حسی کی دبیز چادر میں خود کو لپیٹ رکھا تھا۔

''کیسا ہنستا مسکراتا' قہقہے بکھیرتا بچہ تھا۔ ماں نے لبوں کی مسکان تک چھین لی۔ آخر شادی ہی کی تھی نا۔ کون سا جرم سرزد ہو گیا تھا اس سے۔'' وہ اسکول سے آئی تو پاپا کی کزن سمیرا پھوپھو خوب زور زور سے بولتے ہوئے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''آپا! سنا ہے کہ فراز کا اس سے بچہ بھی ہے۔'' ماما نے سرگوشیانہ لہجے میں استفسار کیا تھا۔ سمیرا پھوپھو نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آں...... ہاں' بچہ تو اب کافی بڑا ہو گیا ہو گا۔ تمہارے آنے سے پہلے کی بات ہے۔'' پھوپھو دلگرفتگی سے بولیں۔

''بڑا پتھر دل ہے بھابھی بیگم کا۔ مانو بیٹے کی حالت دیکھ کر بھی نہیں پسیجتا۔'' وہ آزردگی سے گویا ہوئیں اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ماما کے قریب قدرے جھکتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

''فراز کے ساتھ ساتھ اس معصوم لڑکی کی زندگی بھی تباہ کر کے پھر کیا ضرورت تھی ناعمہ کے ساتھ بیاہ رچانے کی۔ اس نے بھی عین بارات والے دن بھاگ کر اچھی ذلت سے دوچار کیا تھا بھابھی بیگم کو۔ مگر دیکھ لو ابھی تک وہ ہی تکبر اور غرور جھلکتا ہے ان کے لب و لہجے سے۔ اب بھی لے آئیں بہو اور پوتے کو' مگر نہ جی ناک کٹتی ہے' نا آڑے آتی ہے۔''

''فراز نے بھی زندگی کی ہر خوشی خود پر حرام کر لی ہے۔ ناعمہ نہ سہی کوئی اور ہی لے آتیں اماں بہو۔ اسے یوں ٹوٹا بکھرا دیکھ کر دل کٹتا ہے میرا۔'' ماما نے افسردگی سے کہا تھا۔

''فراز کہاں ہامی بھرتا تھا ناعمہ کے ساتھ بندھن باندھنے کی۔ وہ تو بھابھی بیگم نے اپنی قسمیں دے کر

اسے مجبور کیا تھا۔'' پھوپھو نے تلخی سے کہا تھا۔ رحاب نے کچھ چونک کر پھوپھو اور ماما کی طرف دیکھا۔ اس کے حافظے میں گویا یہ بات چپک کر رہ گئی تھی۔ پھر دادی کی اچانک وفات کے بعد چاچو بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گئے تھے۔

رحاب کے ذہن میں وہ منظر ابھی تک محفوظ تھے۔ پاپا اور ماما کتنے ہی عرصے تک چاچو کو مجبور کرتے رہے تھے کہ وہ اپنی بیوی اور بچے کو لے آئیں مگر اتنے کم گو چاچو نہ جانے کیوں اتنا چیخنے چلانے لگتے تھے اور پھر کبھی کبھی تنگ آ کر بے بسی سے رو دیتے۔ آہستہ آہستہ پاپا اور ماما نے ان سے کچھ بھی کہنا سننا ترک کر دیا تھا۔ انہی دنوں ماہا کو چاچو کی شادی کا شوق ہوا تھا۔ وہ روزانہ ہی ماما کا پلو تھام کر کہتی۔

''ماما! چاچو کی شادی کریں نا۔ عیشہ کے چاچو کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ ان کے گھر چاچی آئے گی پیاری سی۔ آپ بھی ہمیں لا دیں پیاری سی چاچی۔'' وہ معصومیت سے کہتے ہوئے اپنی سہیلی کا حوالہ دیتی اور ماما بے بسی سے پاپا کی طرف دیکھنے لگتیں۔

دادی کے جانے کے بعد چاچو مزید تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ آفس سے آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔ بہت غیر محسوس طریقے سے وہ چاچو کو حرف بہ حرف پڑھنے لگی تھی۔ ان کے مزاج کے سارے رنگوں سے اس نے آشنائی حاصل کی۔ چاچو رفتہ رفتہ اس پر کھلنے لگے تھے اور وہ یہی تو چاہتی تھی کہ چاچو اپنے اندر کی گھٹن نکال دیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب انہوں نے اپنی زیست کے اس باب کو کھول کر رحاب کو اس کا لفظ لفظ پڑھا دیا جسے عرصہ دراز سے وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔ مگر رحاب نجانے کیوں ان سے الجھ پڑی تھی۔ شاید لاشعور میں وہ باتیں ابھی تک محفوظ تھیں جو کبھی وقتاً فوقتاً تائی جی اس کے گوش گزار کرتی رہی تھیں۔

''ابا جی نے دھمکی دی تھی فراز کو کہ اگر تم نے اس پٹھانی سے تعلق نہ توڑا تو تمہیں جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔''

رحاب کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ وہ جو چاچو کو بے انتہائی آئیڈیلائز کرتی تھی۔ ایسی باتیں سن کر چیخ کر رہ گئی اور پھر چاچو کے سامنے دل کی بھڑاس نکال کر باہر آئی تو ماما کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے بے انتہا اصرار پر ماما نے اسے وہ اذیت ناک حقیقت بتائی تھی جس نے چاچو کی پوری زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اس پل اس کے دل میں چاچو کی محبت کئی گنا بڑھ گئی تھی اور آنکھیں عقیدت کے موتی برسانے لگی تھیں۔ اسی گھڑی اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ چاچو کے لبوں کی کھوئی ہوئی مسکان لوٹانے کا فیصلہ۔

☆☆☆

''بھنگ پی کر سوئی ہو۔ اب اٹھ بھی چکو۔'' صبح وہ ماہا کے جھنجھوڑنے پر اٹھی تھی۔ ماہا نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو سنہری دھوپ چھن چھن کر اندر آنے لگی۔

''ماما کا فون آیا تھا۔'' ماہا نے کمبل تہہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھیں۔'' رحاب نے بال سمیٹ کر پونی کی۔

''چاچو کی رات کو طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ ویسے اب ان کی طبیعت

بہتر ہے۔'' ماہا کے بتانے پر وہ فوراً فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی تھی۔ جب تک اس نے چاچو سے تفصیلاً بات نہیں کر لی تھی دل کو قرار نہیں آیا تھا وہ اسے تسلیاں دلاسے دیتے رہے اور واپس آنے پر اصرار کرتے رہے تھے۔
رحاب نے بے دلی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے جس عزم اور جس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے یہاں تک کا سفر کی تھا کیسے ممکن تھا کہ وہ یوں ہی بے مراد لوٹ جاتی۔ اب وہ سنجیدگی کے ساتھ اگلا قدم اٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ اس کیلئے اسے ماہا اور دادو کو اپنا ہم راز بنانا تھا اور جب اس نے ماہا اور دادو کے سامنے اتنا بڑا انکشاف کیا تو ان دونوں کے حیرانی سے منہ کھل گئے۔
اس نے ماہا کو بتایا تھا کہ نا صرف وہ شاہ نور کو جانتی ہے بلکہ اس سے مل بھی چکی ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔
''رابی! تم سچ کہہ رہی ہو۔'' وہ بے یقینی سے کپکپاتی آواز میں بولی۔
''مگر بیٹا تم اکیلی وہاں تک جاؤ گی کیسے۔'' دادو فکرمندی سے گویا ہوئیں۔
''بس دادو آپ دعا کیجئے گا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایک مرتبہ صرف اور صرف ایک مرتبہ میں پشمینہ چاچی اور چاچو کا سامنا کروانا چاہتی ہوں۔'' وہ ایک عزم سے مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ دادو اور ماہا نے بیک زبان آمین کہا تھا۔
اگلی صبح وہ دادو اور ماہا کی دعاؤں کے سائے میں رحیم خان کے ہمراہ عازم سفر ہوئی تھی۔ ایبٹ آباد سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کی دوری پر ''مانسہرہ'' کا خوب صورت شہر واقع ہے۔ یہاں سے دو مختلف راستے نکلتے ہیں ایک تو وادی کاغان کی طرف جاتا ہے جبکہ دوسرا وادی دیامر کی طرف۔
''تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کے سفر کے بعد وہ دیامر کے صدر مقام ''چلاس'' تک پہنچ گئے تھے۔ رحیم خان نے اک درمیانے درجے کے ہوٹل کے قریب گاڑی روکی اور پھر اس کیلئے کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے چلا گیا۔ رحاب اردگرد کے مناظر' ہر سو پھیلے سبزے کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اتنا حسن اس قدر دلفریبی' وہ قدرت کے ان حسین نظاروں کو دیکھ کر کھو سی گئی تھی۔ رحیم خان نے اس کی دلچسپی محسوس کر کے ''شتیال'' کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ہزاروں برس پرانے کندہ کاری کے نمونے دکھانے کیلئے گاڑی روکی جو کہ ملکی اور غیر ملکی سیاحت کے شوقین مزاج لوگوں کیلئے بے حد کشش رکھتے تھے۔ شتیال سے بتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ''بسری'' گاؤں واقع ہے۔ اسے بسری تک ہی سفر کرنا تھا۔ یہیں سے ہی ضلع دیامر کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ بلند و بالا فلک بوس پہاڑ' یہاں کی دلکش جھیلیں' ندی نالے' طویل عریض مرغزار' ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے جگہ جگہ بکھرا حسن نگاہوں کو خیرہ کرنے کیلئے کافی تھا۔ اگر وہ سیاحت کیلئے یہاں آئی ہوتی تو ضرور انجوائے کرتی۔ اس وقت وہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ذرا بھی خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔
رحیم خان اس علاقے کی ثقافت کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا۔ وہ بے دھیانی سے سنتی رہی۔
''اس حسین سرزمین کے شمال میں گلگت اور جنوب کی طرف کشمیر اور کاغان کی دلکش وادیاں ہیں۔'' رحیم خان اپنی

ہی جھونک میں بولے جا رہا تھا۔ رحاب بغیر سنے ایسے ہی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ تمام سوچوں کو جھٹک کر وہ اردگرد کے مناظر کی دلکشی محسوس کرنے لگی تھی۔

دیامر کی وادی میں فطرت کی تمام رعنائیاں اپنے ازلی وقار' حسن اور شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ یہاں کی سر بفلک برف سے ڈھکی چوٹیاں۔ سرسبز و شاداب مرغزار' مست سرکش دریا' دلکش آبشاریں' گنگناتے جھرنے وادی کے ایک طرف اخروٹ' انگور' چلغوزہ' ناشپاتی' خوبانی اور سیب کے بلند و بالا درختوں کی بہتات ہے اور دوسری طرف ''بنی'' اور ''کائیل'' کے جنگلات کی بھرمار ہے۔ جن کے متعلق صرف کتابوں میں ہی اس نے پڑھ رکھا تھا۔ آج ان سحر طاری کر دینے والے مناظر کو دیکھ کر دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

''بسری'' کی حدود شروع ہوتے ہی اک نامعلوم سی بے چینی نے اسے گھیر لیا تھا۔ گاڑی اونچے نیچے راستوں پر روانی سے دوڑ رہی تھی۔ راستے میں اس کی نگاہ بڑے سے سائن بورڈ پر لکھے ''پشمینہ خانم ہائر سیکنڈری اسکول'' پر پڑی تو وہ بے انتہا حیران ہوئی۔ کچھ ہی دور اسکول کی وسیع وعریض بلند و بالا پرشکوہ عمارت شان سے کھڑی تھی۔ اردگرد سیب اور ناشپاتی کے باغات تھے۔

رحیم خان نے ایک جگہ گاڑی روک کر شاہ نور کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی خوب صورت سے گھر کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ رحاب دھڑکتے دل کے ساتھ اتری۔ تمام راستے وہ مختلف مکالمے سوچتی آئی تھی جو کہ اسے خانم سے بولنے تھے۔ رحیم خان نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا۔ گیٹ پر موجود پچاس پچپن سالہ خان کی ہمراہی میں وہ اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اسے انتہائی کشادہ و رہوادار کمرے میں بٹھایا گیا تھا جو کہ یقیناً مہمانوں کیلئے مخصوص تھا۔ اخروٹ اور کیکر کی لکڑی سے بنا مضبوط اور دیدہ زیب فرنیچر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا جبکہ سامنے والی دیوار پر شاہ نور کی فل سائز تصویر جلوہ افروز تھی۔ تصویر میں مسکراتا ہوا وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے وہ بڑے تفاخر سے کھڑا تھا۔

رحاب ایک ٹک اس کی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی نشست سے اٹھ کر وہ دو قدم آگے بڑھی اور انگلی کی پوروں سے تصویر کو چھوا۔ اسے اپنے دل کی کیفیت بدلتی محسوس ہوئی تھی۔ دل کی اس بے ایمانی پر وہ اسے ڈپٹتے ہوئے پیچھے ہٹی۔ بے اختیار ہی اس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے کو چھوا تو بہت سی نمی محسوس کر کے گھبرا اٹھی۔ اسی پل آنکھوں میں اشتیاق کی چمک لئے گول مٹول سی قدرے بھرے بھرے جسم والی گوری چٹی پٹھان لڑکی ٹرے میں مشروب سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔

''سلام بی بی۔'' اس نے کچھ شرماتے ہوئے سلام کیا تھا۔ رحاب نے قدرے سنبھل کر سر ہلایا۔

''تم شہر سے آیا ہے۔'' قالین پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ تجسس سے بھرپور لہجے میں بولی تھی۔

''ہاں......'' رحاب مختصر بولی۔

"ایبٹ آباد۔" لڑکی کافی باتونی تھی۔ شرمائی شرمائی مسکان لبوں پر سجائے بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہوں......" رحاب نے ہنکارا بھرا۔

"امارا گل خان بھی ایبٹ آباد میں ہوتی ہے۔" اس نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ رحاب نے کچھ چونک کر اس کے "شرمیلے" انداز کو ملاحظہ کیا اور بے اختیار مسکرا دی۔ اسی پل دروازہ کھلا تھا اور جو خاتون اندر داخل ہوئی تھیں ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر رحاب دیا سناکت رہ گئی۔ بے انتہا سرخ و سفید رنگت، نیلی کانچ سی آنکھیں سر پر سفید دوپٹہ لئے وہ کسی ریاست کی ملکہ ہی تو لگ رہی تھیں۔

"السلام علیکم......" وہ بمشکل ہی بول پائی تھی۔ خانم نے آگے بڑھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ملازمہ سے مخاطب ہوئیں۔

"پری چہرہ! تم ادھر بیٹھی باتیں بگھار رہی ہو، جاؤ مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔" ان کی آواز میں بلا کی نرمی تھی۔ پری چہرہ سر پر چادر جماتے ہوئے "بہتر خانم" بولتی تیزی سے بالکل نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد خانم رحاب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کیسے آنا ہوا بیٹی؟"

"ایکچوئیلی میں شمالی علاقہ جات کی سیر و تفریح کی غرض سے آئی تھی "چلاس" میں میں نے اس گاؤں کی دلکشی و خوبصورت کی بہت تعریف سنی ہے۔ اسی لئے اپنے ڈرائیور کے ہمراہ آ گئی ہوں مگر یہاں آ کر قدرے مایوسی ہوئی کیونکہ قریب دور کوئی بھی ہوٹل، ریسٹورنٹ نہیں ہے۔ یعنی کہ رہائش کا مسئلہ تھا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا میرا آنا......؟" ان چند لائنوں کی ریہرسل وہ پورے راستے کرتی آئی تھی لہٰذا جب بولی تو لہجہ ہموار تھا۔

"کیوں برا لگے گا......" خانم قدرے ناراضی بھرے لہجے میں بولیں۔ "مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے شرف میزبانی بخشا ہے ہمیں۔ آپ تھکی ہوئی ہیں چاہیں تو ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جائیں، میں کھانا لگواتی ہوں۔" خانم اپنے مخصوص شہد آگیں لہجے میں ولیں اور پھر نپے تلے قدم اٹھاتی باہر چلی گئیں۔ رحاب نے طویل سانس خارج کر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اک بوجھ سے اس نے خد کو اس پل آزاد پایا تھا۔ تھکن کی وجہ سے اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ سر میں الگ ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر آئی تو خانم اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"پہلے کھانا کھا لو، پھر آرام کر لینا۔"

"دراصل کھانا تو راستے میں ہی کھا لیا تھا۔ اس وقت چائے کی طلب ہو رہی ہے اگر چائے کے ساتھ کوئی ٹیبلٹ مل جائے تو......"

"کیوں نہیں، میں ابھی بھجواتی ہوں۔ آپ ایسا کریں میرے ساتھ آئیں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔ تا کہ چائے پینے کے بعد آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" اسے ساتھ لئے خانم اوپر آ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ہی ملازمہ چائے اور ٹیبلٹ لے آئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ پلنگ پر ڈھے گئی۔

''چاچو آپ نے کیا کچھ کھو ڈالا ہے۔'' نیند میں جانے سے پہلے اس کے ذہن میں آنے والا واحد خیال یہی تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پلکیں موندے بے خبر سو رہی تھی۔

☆☆☆

ایبٹ آباد سے واپسی پر اس کے ساتھ کامران اور ہاشم بھی آ گئے تھے وہ دونوں اس کے یونیورسٹی فیلو تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہی وہ پچھلے دو دن سے گھر نہیں جا سکا تھا۔ آج ہی ان کی روانگی ہوئی تھی۔ وہ بہادر خان (نوکر) کو کچھ ہدایات دے کر ڈیرے کی حدود سے نکل آیا۔

آڑو کا پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر باغ میں ٹہلتا رہا اور پھل کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اک صحت مند سرخ آڑو اتارا۔ آڑو میٹھا اور رسیلا تھا وہ مطمئن ہو کر بل کھاتی سڑک پر آ گیا۔

''کچھ دن تک ''تڑائی'' لگوا دینی چاہیے۔'' وہ اپنے ہی دھیان میں سوچتا ہوا چل رہا تھا جب نسوانی کھنکتی ہوئی آواز سن کر چونک پڑا۔ دائیں طرف ناشپاتی کے باغ میں سے آواز آ رہی تھی۔

''یار! ان درختوں پر تو کچھ بھی نہیں لگا۔ مجھے تو ایک بھی ناشپاتی نظر نہیں آ رہی۔'' بے حد جھنجلائی سی قدرے خفا خفا آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ماتھے پر سلوٹیں سجائے آواز کی سمت چل پڑا۔

''اوہو بی بی! یہ موسم ناشپتی واشپتی کا نہیں' اگر تم کچھ عرصہ پہلے آتا تو دیکھتا۔ کمبخت ڈالیں (شاخیں) زمین کو سلام دے رہی تھیں۔ اتنا پھل کا وزن تھی۔'' پری چہرہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں تیز تیز بول رہی تھی۔ رحاب کو اس سے باتیں کر کے بہت مزہ آتا تھا۔ اب بھی وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی جب سامنے سے آتے شاہ نور کو دیکھ کر اک پل کیلئے اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ شاہ نور بھی ٹھٹک گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا جس سے ابھی ڈیڑھ ہفتہ پہلے وہ بالکل اتفاقاً ملا تھا۔ اس علاقے میں اس کی موجودگی کم از کم شاہ نور کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

''تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟'' تمام ادب لحاظ بالائے طاق رکھ کے وہ گرجا تھا۔ رحاب نے اک نظر پری چہرہ پر ڈالی اور پھر دھیمے سروں میں گویا ہوئی۔

''تم سے ملنے......'' انداز میں بلا کی بے نیازی تھی۔ شاہ نور کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

''کس مقصد کے تحت یہاں آئی ہو؟''

''مقصد تو خاصا ''نیک'' ہے۔'' رحاب نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ اسے رحاب سے اس درجہ بے باکی کی امید نہیں تھی۔ اس پر سلگتی نگاہ ڈال کر وہ پری چہرہ کی طرف مڑا۔ ''تم کیوں آئی ہو۔''

''وہ لالا! خانم نے بھیجا ہے۔ ام کو بولا ہ بی بی کو سیر کروا ؤ۔'' پری چہرہ نے سہم کر پہلے شاہ نور اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

''تم میرے گھر ٹھہری ہو؟'' شاہ نور نے اس پل اپنی بے خبری کو کوسا تھا۔

''تمہارے نہیں خانم کے گھر۔'' اس نے گویا اطلاع دی تھی۔ شاہ نور اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات

کو بغور جانچتا رہا اور پھر قدرے رخ موڑ کر پری چہرہ سے کہا۔

''تم جاؤ باقی کی سیر میں بی بی کو کروا دیتا ہوں۔''

''میں مہذب لوگوں کی ہمراہی پسند کرتی ہوں۔ ال مینرڈ اور جنگلی' غیر شائستہ لوگ پسند نہیں مجھے۔'' وہ چبا چبا کر بولتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔ پیچھے سے شاہ نور کی واضح بڑبڑاہٹ سنائی دی تھی۔

''اونہہ' مہذب......'' رحاب تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی جبکہ شاہ نور کی نگاہوں کے سامنے ایک اور سوالیہ نشان جگمگا رہا تھا۔ گھر آ کر وہ سیدھا اماں کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ شاہ نور کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ دعا مانگ کر انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بیٹے کے قریب آ ئیں جو کہ کافی مضطرب لگ رہا تھا۔

''اماں! یہ لڑکی کون ہے۔'' اس کا اشارہ رحاب کی طرف تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے پر پھونک مار کر تسبیح سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

''اسلام آباد کی رہنے والی ہے۔ ادھر گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہے۔'' وہ جتنا رحاب کے متعلق جانتی تھیں مختصر سا بتا دیا جبکہ شاہ نور کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

''اماں! آپ بھی ہر ایک پر فوراً بھروسہ کر لیتی ہیں۔ کیا اتنا سا تعارف کافی ہوتا ہے۔'' وہ بے چینی سے کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''ویسے یہ محترمہ جائیں گی کب۔'' شاہ نور کے چبھتے لہجے نے خانم کو کچھ حیران اور کچھ خفا کر دیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا! وہ مہمان ہے ہماری۔ جب تک اس کا دل چاہے گا رہے گی۔ آج سے پہلے تو تم نے کبھی کسی بھی مہمان کے بارے میں اس لہجے میں بات نہیں کی۔'' خانم ازلی سادگی بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔ شاہ نور چڑتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

رات کے کھانے پر اس کی شاہ نور سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاہ نور کو زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھی۔ جب وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو رحاب نے بڑی خوش اخلاق قسم کی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ دانت پیستا اپنی نشست سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''میں بھی تم سے اگلوا کر رہوں گا محترمہ کہ کس مقصد کے تحت تم میرا پیچھا کر رہی ہو۔'' اسے خانم سے باتیں بگھارتے دیکھ کر شاہ نور نے تلخی سے سوچا تھا۔

''یہ فرائیڈ فش تو بہت ہی لذیذ ہے۔ تم بھی چکھو نا۔'' رحاب نے لبوں پر مسکان سجا کر ڈونگا اس کی طرف کھسکایا۔

''تم کھاؤ بیٹی' شاہ نور کو فش پسند نہیں ہے' اس کی اسمیل اسے اچھی نہیں لگتی۔'' خانم نے شفقت سے کہا تھا اس نے یوں سر ہلایا گویا سب سمجھ گئی ہے۔ جب تک وہ بیٹھا رہا رحاب کچھ نہ کچھ اس کی پیٹ میں ڈالتی رہی تھی۔ اک لمحے کیلئے تو شاہ نور کو محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ مہمان ہے اور رحاب میزبان۔

''اچھا یہ سیلڈ تو لو......'' رحاب کی رفتار دیکھ کر اسے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچنا پڑا تھا۔ جب وہ اٹھا تو رحاب بھی فوراً کرسی سرکا اٹھ گئی۔ خانم پہلے ہی جا چکی تھیں۔ شاہ نور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ جب وہ سرعت سے اس کے پیچھے دوڑی۔

''کہاں جا رہے ہو اس وقت' چلو آؤ باتیں کرتے ہیں۔ قسم سے سخت بور ہو رہی ہوں۔'' شاہ نور حیرت سے اس نان اسٹاپ بولتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جسے شاید ضرورت سے زیادہ ہی خود پر اعتماد تھا۔ وہ لب بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر جب بولا تو لہجے میں غراہٹ نمایاں تھی۔

''باتیں تو مجھے بھی تم سے بہت سی کرنا ہیں۔ بس مناسب موقع کی تلاش میں ہوں۔'' اس کے چہرے پر کٹیلی نگاہ ڈال کر وہ تیزی سے اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا تھا۔ رحاب بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

''چاچو کی طبیعت نہ جانے کیسی ہے۔ اگر فون ہوتا تو کر لیتی۔'' پلنگ پر لیٹتے ہوئے اس نے یاسیت سے سوچا تھا۔

''پتا نہیں جو میں کر رہی ہوں وہ درست ہے بھی یا نہیں۔ نہ جانے میں ان لوگوں کے دلوں کو موم کر پاؤں گی بھی کہ نہیں' میرا یہ سفر' طویل مسافت اگر رائیگاں چلی گئی تو......؟'' اس خوفناک زہریلی سوچ نے اسے بےکل کر دیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہ نور کو اس کے باپ کے بارے میں بتانے سے پہلے اس سے دوستی اور اعتماد کا رشتہ قائم کر لے اور پھر ان تمام حقیقتوں سے پردہ اٹھائے جو عرصہ دراز سے دلوں کی دوری کا سبب بنی ہوئی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ شاہ نور اس کے بارے میں کافی مشکوک ہے۔ اس کے شک و شبہات کو وہ دور کرنا چاہتی تھی مگر کیسے؟ وہ جس کام کو بہت سہل سمجھ رہی تھی یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ رات کو دیر سے سونے کی جہ سے صبح وہ لیٹ اٹھی تھی۔ فریش ہو کر جب وہ باہر آئی تو خانم اسکول جا چکی تھیں۔ پری چہرہ اور زہرینہ معمول کے کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ ست قدموں سے چلتی ہوئی تخت پر بیٹھ گئی۔

''کب تک سیر و تفریح کا بہانہ کر کے یہاں ٹھہروں گی۔'' ٹھوڑی گھٹنوں پر سجائے وہ گہری سوچ میں گم ہو چکی تھی اسی لئے تو وہ شاہ نور کی آمد کا اسے پتا نہیں چل سکا تھا۔ وہ تو جب اس نے پری چہرہ کو پکارا تو رحاب چونک کر سیدھی ہو گئی۔

''بی بی! ناشتہ لاؤں؟'' زہرینہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ رحاب نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر سلیپر پیروں میں اڑس کر بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر اس نے پری چہرہ کو آواز دی دوسرے ہی پل پری چہرہ اس کے سامنے موجود تھی۔

''سنو میں خانم کے اسکول جا رہی ہوں۔'' رحاب بجھی آواز میں کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ جب شاہ نور نے اسے آواز دے کر رکنے کیلئے کہا۔

''ٹھہرو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''
رحاب کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی بے چینی اڑنچھو ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔
''سر پہ دوپٹہ لے لو۔'' گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے تحکم سے کہا تھا۔ رحاب نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تاہم کہا کچھ نہیں۔ اسکول کے گیٹ پر اسے چھوڑ کر وہ خود چلا گیا تھا جبکہ رحاب بے خودی کے عالم میں وہیں کھڑی رہی تھی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک۔ اس پل اسے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کے طاقچے پر اک ننھا سا دیا ٹمٹمایا تھا جس کی روشنی نے اس کے اردگرد اجالے بکھیر دیئے تھے۔

☆☆☆

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں احمق ہوں جو کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اماں کو تم نے ٹال دیا ہے مگر مجھے نہیں۔ شرافت سے بتا دو کہ ایبٹ آباد سے لے کر یہاں تک آنے میں کون سا راز پوشیدہ ہے۔ کیوں میرا پیچھا کرتی رہی ہو تم، ان فون کالز کا کیا مقصد تھا۔ تم چاہتی کیا ہو؟''
''محبت......'' شہتوت کی لدی پھندی شاخوں کو بغور تکتے ہوئے وہ بے انتہا سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاہ نور نے پوری شدت کے ساتھ اس کے لہجے میں چھپی سچائی کو محسوس کیا تھا تاہم اس غیر متوقع جواب نے اسے کھولا کر رکھ دیا۔
''بکواس بند کرو اور جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔'' شاہ نور نے غرا کر کہا تھا۔ رحاب نے بے بسی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے اس کے غصیلے تاثرات والے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''تم نے خود ہی تو پوچھا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں اور سچی بات تو یہی ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور بدلے میں بالکل ایسی ہی محبت چاہتی ہوں۔''
''اوہو......تو یہ واردات کب ہوئی؟'' وہ استہزائیہ ہنسا۔
''شاید اس روز جب میں یہاں آئی تھی یا پھر ایبٹ آباد میں جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا یا پھر اس سے بھی بہت پہلے جب تمہارا ذکر پہلی دفعہ اس شخص کے لبوں سے سنا تھا جسے میں بے انتہا چاہتی ہوں۔'' وہ آنکھیں موندے بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے جبکہ وہ ستم گر تو کب کا جا چکا تھا۔

☆☆☆

''اماں! میں شہر جا رہا ہوں کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔'' شاہ نور نے قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں ماں سے پوچھا تھا۔
''نہیں بیٹے! کچھ بھی نہیں منگوانا۔ ہاں ذرا رحاب کو بھی چالاس تک لے جاؤ۔ فون کرنا چاہتی ہے اپنے گھر......''

''میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے کہ جگہ جگہ رکتا پھروں۔ آپ اسے قریبی قصبے میں خود لے جایئے گا۔'' وہ رکھائی سے کہتا ہوا پلٹ گیا تھا جبکہ رحاب گم سم سی سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہ گئی۔

اگلی صبح خانم کے ہمراہ قریبی قصبے میں وہ فون کرنے آئی تھی۔ ماہا سے بات کرنے کے بعد اس نے گھر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس کا ارادہ چاچو سے بات کرنے کا تھا مگر اس کی بدقسمتی کہ ماما نے کال ریسیو کی۔ اس کی آواز سنتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''سیاحت کا شوق ابھی پورا نہیں ہوا۔ کب آ ہی ہو تم دونوں گھر؟ جب بھی فون کرتی ہوں ماہا بتاتی ہے کہ تم باہر ہو۔ کچھ گھرداری ہی سیکھ آؤ خالہ سے کہ بس آوارہ گردی ہی کرنا ہے۔'' رحاب نے بے ساختہ اک لمحے کیلئے ریسیور کان سے ہٹایا۔ اس پل اسے اپنی چھوٹی بہن پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا۔

''یعنی کہ ماما کو نہیں پتا کہ میں کہاں پہنچی ہوئی ہوں۔'' رحاب نے سوچا اور پھر قدرے بشاش لہجے میں بولی۔

''ماما! یہاں کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار ہے۔ جگہ جگہ حسن و رعنائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں کہ دل خود بخود اللہ بزرگ برتر کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں یہیں پر ہی رہ جاؤں۔ اتنا سکون ہے یہاں پر نہ کوئی شور نہ ہنگامہ......'' وہ اپنی ہی جون میں کہے جا رہی تھی۔ خانم نے کچھ چونک کر اس کے حسین چہرے کو نگاہ بھر کر دیکھا۔ اک خوشگوار سی ہلچل دل و دماغ میں ہوئی تھی۔

''اف میں نے بھی چند سیکنڈوں میں کیا کیا سوچ لیا ہے۔'' انہوں نے بے ساختہ خود کو ڈپٹا اور ایک دفعہ پھر رحاب کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ماما! آپ بھی نہ بس ایک ہی بات کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ مجھے نہیں کرنی ابھی شادی وادی۔ آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔'' اس نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا تھا۔

''چھوڑیں ان باتوں کو آپ یہ بتائیں کہ چاچو کی طبیعت کیسی ہے۔'' رحاب نے ریسیور دوسرے کان کی طرف منتقل کر کے کن انکھیوں سے خانم کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بدرنگ شیشے کے پار حسین مناظر کی خوبصورتیوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ رحاب نے مزید دو چار باتیں کر کے فون رکھ دیا۔

وہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم گاڑی تک آئیں۔ ہیبت خان نے انہیں آتا دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے ہیبت خان سے کہا۔

''خان! وادی داریل تک چلو...... رحاب بی بی کو دیامر کی سب سے حسین اور منفرد وادی کی سیر کروا لائیں۔'' داریل پہنچنے سے پہلے راستے میں جتنے بھی خاص مقامات آئے تھے خانم نے گاڑی رکوا کر رحاب کو ان کی خصوصیت ان علاقوں میں بسنے والوں کے رہن سہن اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔

داریل کے باسی دور قدیم سے ہی بے انتہا مذہبی اور عقیدت مند لوگ ہیں۔ انہیں مذہب سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ جب اسلام ان علاقوں میں ابھی نہیں پھیلا تھا تب بھی یہاں کے لوگ انتہائی مذہب پرست تھے۔

اسلام کی آمد سے پہلے یہاں پر بدھ مذہب کو مانا جاتا تھا۔ جب اسلام دور دراز کے علاقوں تک پھیلا اور دلوں میں ایمان کی روشنی نے اجالے بکھیرے تو اہل ایمان نے اپنے دلوں اور علاقوں سے بدھ درس گاہوں کو مٹا دیا۔ یہاں کی عورتیں بے حد جفاکش اور بہادر ہیں۔ اس کی ایک مثال تو خود خانم بھی تھیں۔ جو کہ انتہائی پسماندہ گاؤں سے اٹھ کر ایبٹ آباد تک گئیں اور نا صرف علم کے زیور سے خود کو آراستہ کیا بلکہ اپنے گاؤں میں تمام سہولیات سے مزید تعلیمی درس گاہ بنا کر جہالت کے اندھیروں کو روشنیوں میں بدل دیا۔

یہاں پر بھی پھلوں کے باغات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تقریباً دو بجے کے قریب وہ داریل پہنچے تھے۔ رحاب کا تھکن کے مارے برا حال تھا۔ خانم اسے اپنے چچا کے گھر بھی لے کر گئی تھیں۔ گھنٹہ بھر آرام کرنے کے اور پر تکلف کھانا کھانے کے بعد انہوں نے جانے کی اجازت مانگی تو خانم کی دونوں چچا زاد بہنیں ٹھنکنے لگی تھیں۔

''رک جائیں خانم۔'' وہ دونوں اصرار کر رہی تھیں۔ خانم نے بمشکل ان سے اجازت مانگی تھی دوبارہ آنے کے وعدے کے ساتھ۔ خجستہ اور خوش بخت نے بمشکل ہی اجازت دی تھی۔

رحاب کو یہ پڑھی لکھی بااخلاق فیملی بہت پسند آئی تھی۔ دونوں لڑکیاں نا صرف تعلیم یافتہ بلکہ بہت سلیقہ منداور سگھڑ بھی تھیں۔ اتنے مختصر سے وقت میں انہوں نے بے حد پھرتی سے کھانا تیار کیا تھا رحاب حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ اتنے سے وقت میں اس سے تو چائے تک نہیں بن سکتی تھی۔ کجا کہ کھانا پکانا' رحاب نے پہلی مرتبہ اخروٹ' بادام' کشمش اور چلغوزہ کے تڑکے والی بریانی کھائی تھی۔ جانے سے پہلے مرجان بی بی نے انتہائی خوبصورت شال اور کڑھائی والا سوٹ بطور گفٹ دیا تھا اسے۔

رات نو بجے کے قریب وہ لوگ گھر پہنچے تھے۔ رحاب تو آتے ہی پلنگ پر ایسی گری کہ اگلی صبح ہی آنکھ کھل سکی تھی۔ وقت دیکھا تو آٹھ بج چکے تھے۔ نماز تو قضا ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ وضو کرنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی۔ تلاوت کے بعد اس نے سچے دل کے ساتھ گڑگڑا کر دعا مانگی تھی۔ دل کا بوجھ کچھ ہلکا سا ہو گیا تھا۔ اس نے یونہی کھڑکی میں سے جھانکا تو شاہ نور پر نگاہ پڑی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے نیچے چلی آئی تھی۔ شاہ نور اپنے ہی دھیان میں مگن پودوں کی جھاڑ جھنکاڑ اور اضافی شاخیں کانٹ چھانٹ رہا تھا۔ رحاب اس کے قریب پہنچ کر ہولے سے کھنکاری اور پھر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی تھی۔

''ہم سے بہتر تو یہ پھول پودے ہی ہیں جن پر اتنی توجہ دی جا رہی ہے۔'' شاہ نور نے قدرے رخ موڑ کر ایک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور پھر دوبارہ سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آج گھر میں کیوں نظر آ رہے ہو' خیریت تو ہے نا۔'' عموماً وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی چلا جاتا تھا۔ خلاف توقع اسے گھر میں موجود پا کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ شاہ نور نے کٹر پھینک کر ہاتھ جھاڑے۔

''یہ گھر میرا ہے محترمہ۔'' شاہ نور دانت پیس کر جتایا تھا۔

''باپ کا گھر اپنا ہوتا ہے۔ یہ گھر تمہارے نانا کا ہے تمہارا نہیں۔'' غلط موقع پر غلط بات اس کے منہ

سے نکل گئی تھی۔ شاہ نور کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا۔ آنکھیں خون چھلکانے لگی تھی۔ لب بھینچتے ہوئے اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا سامنے کھڑی لڑکی کا گلا دبا دے۔ جوانجانے میں اس کے زخموں پر کھرنڈ اتار گئی تھی۔ اگر وہ اماں کی مہمان نہ ہوتی تو وہ اسے اس گستاخی کی ایسی کڑی سزا دیتا کہ ساری زندگی وہ بھول نہ پاتی' اسے پتا تو چلتا' احساس تو ہوتا کہ دلوں کو چھیدنے کی تکلیف کیا ہوتا ہے۔ رحاب اسے غصے سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی وہ چاہ کر بھی اسے روک نہیں پائی تھی۔

اگلے اکتیس گھنٹے اس کے اس پشیمانی میں گزرے تھے۔ جب تک وہ آ نہیں گیا تھا اور رحاب نے اس سے معذرت نہیں کر لی تھی وہ اسی طرح جلے پیر کی بلی کی طرح چکراتی رہی تھی۔ خانم نے ایک دو مرتبہ اس کی بے قراری محسوس کر کے وجہ معلوم کرنا چاہی مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں۔

اگرچہ شاہ نور نے اس کی معذرت قبول کر لی تھی۔ مگر پھر بھی نجانے کیوں رحاب مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔ قریبی مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ خانم تخت سے اٹھ کر وضو کرنے چل دیں اور رحاب بھی قمیص کی نادیدہ سلوٹیں درست کرتی باہر نکل آئی۔

موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل تیر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پرنم ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرائی تو موڈ خود بخود ہی فریش ہو گیا۔

ڈیرے کی حدود شروع ہوتے ہی اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ آڑو کا پھل اتارا جا رہا تھا۔ اسی لئے ڈیرے پر اچھی خاصی گہما گہمی تھی۔

بہادر خان کو ہدایات دیتا جونہی وہ پلٹا نگاہ سامنے سے آتی رحاب پر پڑی۔ شاہ نور نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر خود تیزی قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ ''کیوں آئی ہو؟'' خلاف معمولی وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''ایسے ہی بور رہی تھی۔ سوچا تم سے گپ شپ ہی کر لی جائے۔'' رحاب نے لاپروائی سے کہا۔

''ہمارے درمیان تو گویا بہت ہی اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہیں نا؟'' شاہ نور مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''تعلق بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔'' وہ معنی خیزی سے گویا ہوئی تھی۔ شاہ نور ہنوز مسکرا رہا تھا۔

''بعض تعلق مبہم ہوتے ہیں اور بعض واضح۔ جیسا کہ میرے اور تمہارے درمیان (دل) کا تعلق اور میرا اور تمہارا خون کا رشتہ۔'' رحاب بے اختیار سوچنے لگی تھی۔

''تم گھر چلو شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔'' اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا ہوا وہ نرمی سے بولا تھا۔ رحاب سر ہلا کر پلٹ گئی۔

☆☆☆

''اماں! رحاب کب تک جائے گی۔''

''کیا ہو گیا ہے بیٹے تمہیں' کیا میں ہاتھ سے پکڑ کر اسے نکال دوں۔ تم کیوں اس کے بارے میں

اتنے مشکوک ہو۔ وہ کچھ نہیں چرا کر لے جائے گی ہمارا۔ اچھے معزز گھرانے کی لڑکی ہے اور۔" خانم نجانے اور بھی کیا کیا کہہ رہی تھیں رحاب سے مزید سننا دشوار ہو گیا۔ منہ پر ہاتھ رکھے آنسو پیتی وہ دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی جبکہ ادھر شاہ نور' خانم سے الجھ رہا تھا۔

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا۔" وہ جھنجلایا اور پھر ناراضی بھرے انداز میں بولا۔ "میں تو یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اگر اس کا مزید رکنے کا ارادہ ہے تو کسی دن اسے فارم ہاؤس دکھا لاؤں گا اور آپ نجانے کیا سمجھی ہیں۔" خانم نے حد درجہ حیرانی سے بیٹے کی طرف دیکھا تھا جس کے خیالات کسی حد تک رحاب کے بارے میں واقعی کچھ اچھے نہیں تھے۔ وہ اس کایا پلٹ پر ششدر سی تھیں۔ تاہم یہ تبدیلی انہیں پسند بھی آئی تھی۔ مہمان کے ساتھ بیٹے کا اکھڑا اکھڑا سا رویہ انہیں خجالت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ قدرے مطمئن سی ہو گئیں۔

"ہاں تو ٹھیک ہے تم کل رحاب کو ساتھ لے جانا۔"

دوسری صبح خانم نے پری چہرہ کو اوپر بھیجا تھا تا کہ رحاب کو جگائے۔ تھوڑی دیر بعد پری چہرہ منہ لٹکائے واپس آ گئی تھی۔

"بی بی کہتا ہے' ام کہیں نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟" خانم کے ساتھ شاہ نور بھی ٹھٹکا تھا۔

"ام کو نہیں پتا لالا۔" پری چہرہ کو نہ جانے کا قلق ہو رہا تھا۔ جب خانم نے اسے بتایا کہ اسے بھی رحاب کے ساتھ فارم ہاؤس جانا ہے تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی تھی۔ بہن بھائیوں سے ملنے کی خوشی میں اس نے ڈھنگ سے بال بھی نہیں بنائے تھے' بس جلدی جلدی کپڑے پہنے' چادر کی بکل ماری اور آ گئی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" خانم اوپر جانے لگیں تو شاہ نور نے انہیں روک دیا تھا۔ جب وہ دستک دیے کر اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پلنگ پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے شاید رو رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور پھر تلخی سے بولی۔

"کیوں آئے ہو تم؟"

"تمہیں روتے دھوتے دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لئے آیا ہوں۔" شاہ نور اس کی شدت گریہ سے سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

"مجھے تمہارے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا ہے۔"

"تمہیں جانا تو پڑے گا۔ کیونکہ میں نے صرف اور صرف تمہارے خاطر اتنے ضروری کام کل پر ڈال دیئے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ رحاب تنک اٹھی۔

"میں نے تم سے فرمائش نہیں کی تھی کہ مجھے فارم ہاؤس دکھا کر لاؤ۔"

"اگر تم فرمائش کرتیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ بہر حال تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں تیار ہو کے نیچے آ جاؤ۔"

''میں نے کہا نا کہ مجھے نہیں جانا۔'' رحاب نے چلا کر کہا تھا۔ شاہ نور کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔

''نہ جانے کی وجہ بتا دو۔''

''تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ تڑخ کر بولی تھی۔

''احترام کے دائرے میں رہ کر بات کیا کرو۔ تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''میں تمہیں اتنا بڑا نہیں سمجھتی۔''

''اب صرف آٹھ منٹ ہیں تمہارے پاس ریڈی ہو جاؤ۔'' شاہ نور نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''ہیبت خان سے کہیں مجھے چلاس تک چھوڑ آئے۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' رحاب نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

''تم نہیں جاؤ گی۔'' شاہ نور نے سختی سے کہا تھا۔ رحاب نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کیوں۔''

''کیونکہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔ تمہارے جانے کے متعلق میں اور اماں فیصلہ کریں گے کہ کون سا دن مناسب ہے۔'' شاہ نور مسکرایا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے میں ابھی اور اسی وقت جاؤں گی۔'' وہ آگ بگولا ہو کر چلائی تھی۔ رات کا منظر' باتیں یاد آئیں تو وہ نئے سرے سے سلگ اٹھی تھی۔ اپنی انا اور وقار اسے جان سے بھی بڑھ کر عزیز تھا۔ اپنی عزت نفس کا گلا نہیں گھونٹ سکتی تھی وہ' اس نے اٹھ کر الماری میں سے کپڑے نکالے۔ پلنگ کے نیچے سے سوٹ کیس گھسیٹا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر شاہ نور کے وجود میں حرکت ہوئی تھی دوسرے ہی پل وہ اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔

''مجھے اپنا دیوانہ بنا کر کہاں جا رہی ہو۔'' شاہ نور نے سلگتے لہجے میں کہہ کر اس کے شانوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا تھا۔ وہ ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

''بولو جاؤ گی؟''

''جانا تو ہے۔'' اس نے پلکیں جھکا کر لرزیدہ آواز میں کہا۔ دل پر گویا ٹھنڈی پھوار پڑی تھی۔

''واپس آنے کیلئے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔'' شاہ نور کے لہجے کی گھمبیرتا اس کے دل کے تاروں کو ہلا گئی تھی۔ رحاب نے بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاہ نور کی آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں آباد تھا۔ رحاب کی پلکیں بار حیا سے جھک گئیں۔ وہ تنہا نہیں تھی محبت کے اس سفر میں شاہ نور بھی اس کے ساتھ اس کے ہم قدم تھا۔

☆☆☆

''تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔'' ٹھنڈے صاف شفاف پانی میں ننھے منے کنکر پھینکتی رحاب کو

اس نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔جھیل کے کنارے اونچے سے پتھر پر بیٹھی وہ پانی میں بنتے بکھرتے بھنور دیکھ رہی تھی۔ وہ اس شغل میں اس قدر محو تھی کہ شاہ نور کی آواز بھی نہ سن سکی۔

''اے محترمہ! میں آپ سے مخاطب ہوں۔'' شاہ نور نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ شاہ نور مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور ایک دفعہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ہم دو بہنیں ہیں' بھائی کوئی نہیں۔ ماما ہاؤس وائف ہیں جبکہ پاپا کا گاڑیوں کا شورروم ہے۔ میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے جبکہ ماہا ابھی زیر تعلیم ہے۔'' اس نے مختصر سا اپنے بارے میں بتایا۔

''اب تم بتاؤ اپنے بارے میں۔'' رحاب نے آخری کنکر پھینک کر اس کی طرف رخ کیا تھا۔

''میرے بارے میں تم مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہو۔'' شاہ نور مسکرایا تھا۔ رحاب بھی ہنس پڑی۔

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

''میں اپنی اماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ تھوڑا بہت ہم نے بھی پڑھ رکھا ہے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد جاب کی ایک دو اچھی آفرز آئی تھیں مگر میرا دل نہیں مانا۔ مجھے اپنے اس خطے سے بہت محبت ہے جبکہ یہاں کے لوگوں سے عشق۔ اس علاقے کی ترقی اور خوش حالی کیلئے میرے نانا اور اماں نے انتھک محنت کی ہے۔ بستی میں موجود دو بڑے میڈیکل اسٹور اور چھوٹا سا کلینک نما ہسپتال اماں اور نانا کی محنت کا نتیجہ ہے جبکہ اس اسکول کی عمارت کا خواب میں نے اس وقت دیکھنا شروع کیا تھا جب خوابوں کے معنی و مفہوم کا پتا بھی نہیں ہوتا۔ پانچ سال کے مختصر سے عرصے میں اسکول کی عمارت کھڑی ہوگئی تھی مگر بدقسمتی سے میرے نانا اس شاہکار کو دیکھ نہیں پائے تھے۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی آزردگی تھی۔ رحاب نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور کچھ سوچ کر آہستگی سے بولی۔

''تم نے اپنی اماں اور نانا کا ذکر کیا ہے جبکہ بابا۔'' وہ جھجک کر خاموش ہوگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے جھڑک کر خاموش کروا دے گا۔

''میرا باپ میرے لئے مر چکا ہے۔'' وہ کٹیلے لہجے میں گویا ہوا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' رحاب نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''اس شخص نے میری ماں کو اس وقت چھوڑ دیا تھا جب میں ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ میرا بس چلے تو اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اسے جلا کر راکھ کر دوں یا پھر زندہ ہی زمین میں گاڑ دوں۔'' اس کے لہجے میں بھوکے شیر کی سی غراہٹ تھی۔ رحاب کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

''دفع کرو اس ذکر کو' چلو آؤ گھر چلتے ہیں۔'' شاہ نور نے بوجھل سانس خارج کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ رحاب بھی کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ گھر آئے تو خانم کو اپنا منتظر پایا۔

''ولی خان بتا کر گیا ہے کہ گل مینا کا فون آیا ہے۔ عرش چھٹیاں گزارنے آ رہی ہے۔ لوکل بس کے ذریعے

چالا اس تک آئے گی۔ تم جا کر اسے لے آنا۔'' خانم بے حد پرجوش تھی۔ رحاب ''گل مینا'' کے ذکر پر ٹھٹک گئی۔

''میں فارغ نہیں ہوں اماں! آپ ہیبت خان کو بھیج دیجئے گا۔'' عرش کے ذکر پر اس کا انداز اور لب و لہجہ ایسے ہی روکھا پھیکا اور کڑوا ہو جاتا تھا۔

''میری بہت ہی پیاری سہیلی کی بیٹی ہے عرش' ڈاکٹر ہے اور کالج میں پڑھاتی بھی ہے۔'' خانم اب رحاب کو عرش کی چیدہ چیدہ خوبیوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔ شاہ نور بے زار سے ہو کر اٹھ گیا تھا۔ رحاب نے اس کی بے زاری واضح نوٹ کی تھی۔ پری چہرہ اور زہرینہ کچن میں مصروف تھیں۔ خانم کے اٹھنے کے بعد وہ ان کے پاس کچن میں آ گئی تھی۔

''عرش بی بی آ رہا ہے۔ اب امارا خیر نہیں۔ بھاگ بھاگ کر جان نکل جاتی ہے اماری ٹانگوں میں سے۔ اوپر سے باتیں اور نخرہ اللہ کی پناہ۔'' پری چہرہ بلند آواز میں زہرینہ سے کہہ رہی تھی۔

''سنا ہے بی بی ڈاکٹر ہے۔ ام اماں کی دوا لکھوا لے گا اس سے اور۔'' زہرینہ ڈاکٹرنی کے آنے کا سن کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ پری چہرہ نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''بی بی ڈاکٹرنی تو ہے پر امیروں کی' مارے غریبوں کی نہیں۔ اس کو تو ام جیسوں سے وہ کیا کہتے ہیں۔ ہاں اسمل آتا ہے۔'' پری چہرہ نے گوشت دھوتے ہوئے تلخی سے کہا تھا اور پھر دروازے میں کھڑی رحاب کو دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

''بی بی! کچھ چاہئے۔''

''ہاں اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔''

''کیوں نہیں ام ابھی لایا۔ تم چلو۔'' وہ نہایت احترام سے بولی تھی۔ اپنی اچھی عادتوں اور ہمدرد فطرت کی وجہ سے خانم کی یہ مہمان نوکروں تک کو بہت پسند تھی۔

چھ بجے کے قریب عرش صاحبہ تشریف لے آئی تھیں۔ آتے ہی خانم کے پاس تخت پر بیٹھی انتہائی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ جس طرح کے تفتیشی انداز میں عرش نے رحاب کے متعلق استفسار کیا تھا۔ خانم کو بھی کچھ اچھا نہیں لگا تھا تاہم وہ بولی کچھ نہیں تھیں۔ عرش کے ہر ہر انداز میں مالکانہ تاثر چھلکتا تھا۔

''تم کب سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ جانا کب ہے؟'' جیسے سوال پوچھ پوچھ کر ڈاکٹرنی نے رحاب کو بے حد بے زار کر دیا تھا۔ اس لئے وہ کھانا لگنے سے پہلے ہی اوپر چلی گئی۔

''شاہ نور کیوں نہیں مجھے لینے آیا۔'' وہ خانم کے گلے میں بانہیں ڈالے دلار سے بولی تھی۔

''ضروری کام سے کہیں جانا تھا اسے۔ تم یہ بتاؤ کہ ماما کیوں نہیں آئیں۔''

''آنا تو وہ بھی چاہ رہی تھیں مگر بالکل اچانک ہی لاہور سے پھوپھو اپنی فیملی کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ اس لئے پروگرام بدلنا پڑا۔'' عرش بے قراری سے بار بار بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پری چہرہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ عرش کی شاہ نور سے ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تھی۔ وہ اپنی خفگی کا

اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''جناب! آج کل کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے ہیں۔'' شاہ نور نے اک نظر اس کے خفا خفا چہرے پر ڈالی اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پری چہرہ گرم گرم کباب لے آئی تھی۔

''رحاب کہاں ہے' کھانا نہیں کھائے گی۔''

''بی بی کے سر میں درد ہے۔ دوا کھا کر سو گیا ہے وہ'' پری چہرہ کے بتانے پر اس نے سر ہلایا۔ عرش نے تیکھی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر بے دلی سے چاول ٹونگنے لگی۔

آئندہ آنے والے دنوں میں رحاب سخت بوریت کا شکار رہی تھی۔ شاہ نور ان دنوں کم کم ہی گھر آتا تھا۔ زیادہ تر اس کا وقت ڈیرے پر ہی گزرتا۔

کافی دنوں بعد اسے گھر میں موجود پا کر رحاب کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا تھا۔ اسے جو بے نام سی بے چینی اذیت دے رہی تھی وہ ایک دم ہی رفع ہو گئی۔ وہ سرعت سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو عرش صاحبہ پہلے سے موجود تھیں۔ کوفت و جھنجلاہٹ کے مارے رحاب کا برا حال ہو گیا۔ وہ بے دلی سے پلٹ گئی تھی۔

ادھر ڈاکٹرنی صاحبہ شکوے شکایات کا دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔ شاہ نور چونکہ رحاب کو مڑتے دیکھ چکا تھا لہٰذا جلد از جلد عرش کے ٹلنے کی دعا کرنے لگا۔

''مجھے آئے ہوئے آج چوتھا دن ہے اور تم مجھے کہیں بھی گھمانے پھرانے نہیں لے کر گئے؟''

''ایک سو بیس دفعہ تو تم نے یہ علاقہ دیکھا ہے۔ وہ ہی پہاڑی ہیں وہ ہی درخت ہیں' وہی آبشاریں اور جھیلیں ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ اب تو تمہارے دیکھنے کیلئے اس جگہ میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میری بات مانو تو بنی کے جنگلات کی سیر کر آؤ۔ بس اسی جگہ کے دیدار سے تم محروم ہو۔''

''تم ساتھ چلو تو جنگل ہی کیا صحراؤں کی خاک بھی چھان لیں گے۔'' عرش انتہائی دلبرانہ انداز میں بولی تھی۔ شاہ نور بے نیازی سے مسکراتا رہا۔

''لگتا نہیں کہ تم ڈاکٹر ہو۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ عرش اگرچہ اس کے طنز کو سمجھ چکی تھی لیکن ڈھیٹوں کی طرح مسکراتی رہی۔

دوسرے ہی دن صبح صبح وہ اس علاقے کی پسماندگی کو کوستی ساتھ والے قبضے میں ماما کو فون کرنے چلی گئی تھی۔ ولی خان عرش کو دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا اور پھر فون سیٹ اس کے قریب رکھ کر خود باہر چلا گیا۔

''کب آ رہی ہیں ماما آپ'' عرش نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''خیر تو ہے بیٹا! تم پریشان لگ رہی ہو۔''

''بس آپ جلدی سے آ جائیں' اب جلد از جلد میری اور شاہ نور کی انگیج منٹ کا اعلان ہو جانا چاہئے۔ مجھے آس پاس خطرے کی بو آ رہی ہے۔'' عرش فکرمندی سے گویا ہوئی تھی۔

''سیدھی طرح بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے۔ الٹی سیدھی ہانکے جا رہی ہو۔'' دوسری طرف گل مینا چیخ کر بولی تھیں۔

''مجھے تو رحاب اور شاہ نور کے درمیان کوئی چکر لگ رہا میری چھٹی حس مجھے غلط انفارم نہیں کر رہی ہے۔''

''یہ رحاب ہے کون۔'' گل مینا نے غصے سے پوچھا۔

''پتا نہیں کون ہے۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ سیر و تفریح کی غرض سے آئی ہے۔''

''پشمینہ کے رشتے داروں میں سے تو نہیں۔''

''نہیں۔''

''اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں دو تین دن تک آ جاؤں گی۔'' گل مینا نے اسے تسلی دلاسے دے کر فون بند کر دیا تھا۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ رحاب کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ عرش کی آمد اس کیلئے بے شمار الجھنوں کا باعث بنی تھی۔ اب وہ جلد از جلد شاہ نور سے دوٹوک بات کرنا چاہتی تھی مگر نجانے کیوں اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ یہ بزدلی، گھبراہٹ و بے قراری محبت کے کھو جانے کے ڈر سے تھی۔ وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی۔ شاہ نور کس طرح سے پیش آئے گا؟ خانم کیا سوچیں گی؟ اور سب سے بڑی بات یہ لوگ میرا یقین کریں گے بھی یا نہیں۔

اسی پل رحاب کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ پہلے اس نے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا تھا مگر دستک کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ وہ پیروں میں سلیپر اڑس کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ برآمدہ اور صحن عبور کر کے وہ بیرونی گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔

''کون ہے......؟'' اس نے جی کڑا کر کے بلند آواز میں پوچھا۔ دوسری طرف زہرینہ کی منمناتی آواز سنائی دی تھی۔ رحاب نے حیرانی کے عالم میں دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے زہرینہ؟''

''بی بی! مارا بھائی کی بیوی بوت بیمار ہے۔ لالا سے کہنا ہے ہیبت خان کو بولے اس کو شہر لے چلے۔'' وہ بھرائی آواز میں تفصیل بتانے لگی تھی۔

''شہر جانے میں تو بہت وقت لگے گا جبکہ تم بتا رہی ہو کہ اس کی حالت کافی نازک ہے۔ تم ایسا کرو میرے ساتھ آؤ۔ ڈاکٹر عرش سے کہتے ہیں کہ وہ تمہاری بھابھی کو دیکھ لے ڈلیوری کیس ہے ذرا سی تاخیر ماں اور بچے کی جان لے سکتی ہے۔'' رحاب تیز تیز بولتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف بڑھی تھی۔

چوتھی دستک پر عرش نے بمشکل ہی اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ رحاب اور زہرینہ کو دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوئی۔

''عرش! پلیز تم ہمارے ساتھ آؤ۔ اس بے چاری کی بھابھی بہت بیمار ہے۔ ذرا اسے دیکھ لو۔ یہاں اردگرد کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے جسے بلا لیا جائے جبکہ شہر بہت دور ہے۔ پلیز جلدی آؤ......'' رحاب کے ساتھ پاؤں

زہرینہ کی حالت دیکھ کر پھولے جا رہے تھے۔عرش نے بہت اطمینان کے ساتھ اس کی ساری بات سنی تھی۔

''آئم سوری! میں نے گائنی میں اسپلائزیشن نہیں کیا۔'' اس نے بے حد روکھے لہجے میں کہتے ہوئے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔رحاب اس کا جواب سن کر سلگ اٹھی۔

''تم ڈاکٹر ہو کچھ نہ کچھ تو ٹریٹمنٹ دے سکتی ہو۔کم از کم شہر لے جانے تک اس کی حالت کچھ تو سنبھل جائے۔'' رحاب کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اس بے حس کے منہ کو ہی نوچ لیتی۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی' تم لوگ اپنا وقت ضائع مت کرو۔'' وہ پلٹتے ہوئے رکھائی سے بولی تھی۔رحاب حق دق سی اس کی پشت کو دیکھنے لگی۔عرش بلند آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔

''اونہہ...... میں ان پہاڑی عورتوں کے بچے پیدا کرواؤں۔بہت شوق ہے ان عورتوں کو درجنوں کے حساب سے بچے پیدا کرنے کا۔خوامخواہ نیند خراب کر دی ہے۔'' عرش کو دل ہی دل میں گالیوں سے نوازتی وہ مجبوراً شاہ نور کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔اسے دروازے کے بیچ کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔''زہرینہ! تم جا کر انہیں تیار کرو۔میں آرہا ہوں۔'' زہرینہ کے پیچھے وہ بھی گاڑی کی چابی اور والٹ لے کر نکل گیا تھا۔جانے سے پہلے اس نے اک لمحے کیلئے رحاب کے قریب رک کر کہا۔

''تم سو جاؤ...... خان گیٹ بند کر لے گا......'' شہادت کی انگلی سے اس کے رخسار کو چھو کر وہ نرمی سے بولا تھا اور پھر سرعت سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

''تم یہاں بیٹھی ہو اور پوری بستی میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں تمہیں۔'' وہ اپنی پسندیدہ جگہ جھیل کے کنارے اسی پتھر پر بیٹھی پانی میں کنکر پھینک رہی تی جب شاہ نور اسے آوازیں دیتا ڈھونڈتا ہوا ادھر آ گیا تھا۔رحاب بے دلی سے مسکرا دی۔

''تمہیں یہ جگہ کچھ زیادہ پسند ہے۔''

''ہوں...... بہت سکون ہے یہاں پر' دل کرتا ہے آنکھیں موندے خاموشی سے بیٹھی رہوں۔کوئی آواز نہ ہو' شور نہ ہو' بس تنہائی اور خاموشی ہو۔''

''خیریت تو ہے اتنی یاسیت......'' شاہ نور نے کچھ حیرت سے کہا تھا۔

''شاہ نور! ایک بات کہوں......'' کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے تھے اور پھر جب وہ بولی تو بے انتہا سنجیدہ تھی۔شاہ نور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کل صبح میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔تمہاری ایک ''امانت'' میرے پاس ہے۔جو کہ رائٹنگ ٹیبل پر رکھ کر آئی ہوں میں۔'' اک پل کی خامشی کے بعد اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''تم اس حقیقت کو مان جاؤ گے کہ میرا اور تمہارا بہت گہرا نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے......؟ تم......تم میرے چاچو فراز سکندر کے اکلوتے بیٹے ہو شاہ نور۔'' رحاب نے لب کاٹتے ہوئے اس کے سر پر گویا بم بلاسٹ

کیا تھا۔ وہ حیرت‘ دکھ اور بے یقینی کے احساس سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس انکشاف نے اسے گم سم کر دیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ شاہ نور کو تو گویا زمان و مکان بھول گئے تھے۔ بس ہر طرف سے ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ”تم میرے چاچو فراز سکندر کے بیٹے ہو۔“

کیسی دل چیر دینے والی تلخ حقیقت تھی۔ شاہ نور کے دل میں نفرت کا ایک طوفان سا اٹھا تھا۔ آنکھیں یک لخت ہی لہو رنگ ہو گئیں۔ کانوں سے دھویں کی گرم لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے رحاب کی طرف دیکھا۔ وہ دھیمے اداس لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی کہ اس حقیقت کو تمہیں بتا دینے کے بعد میں تمہیں پالوں گی یا ہمیشہ کیلئے کھو دوں گی۔ جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کا مجھے یقین تھا کہ میں جیتوں گی لیکن اس وقت تمہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں ہار گئی ہوں میرا یقین ہار گیا ہے اور......اور میرا دل بھی ہار گیا ہے......سب سے بڑا سچ یہی ہے کہ میں یہاں ایک خاص مقصد لے کر آئی تھی مگر اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ یہ ٹھنڈے پانی کی جھیل‘ بلند و بالا‘ یہ اونچے پہاڑ اور سرسبز و شاداب پیڑ اس بات کی گواہی دیں گے۔ میں تم سے......“

”بکواس بند کرو......“ وہ پوری شدت سے چلایا تھا۔ ”دھوکے باز‘ جھوٹی مکار عورت۔“ مغلظات کا اک طوفان اس کے لبوں سے نکلا تھا اور رحاب کو ششدر رہ گیا۔

”اتنا عرصہ ہمیں بے وقوف بناتی رہی ہو۔ گھٹیا عورت۔“ وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

”یہاں آنے کے فوراً بعد میں تم کو یہ سب بتا دینا چاہتی تھی مگر......“ رحاب نے لب کاٹتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”تمہیں اس جگہ کا پتا کس نے دیا ہے......؟“ اس نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

”پلوشہ نے......“ رحاب سر جھکا کر بولی۔

”اوہو......تو گویا تم پوری پلاننگ کے ساتھ آئی ہو۔ تمہارا مجھ سے ٹکرانا‘ فون کالز کرنا اور یہ چاہتوں کا ڈھونگ......خوب بہت خوب‘ اتنی اچھی ایکٹنگ پر تمہیں ایوارڈ دینا چاہئے۔“ شاہ نواز نے غرا کر کہا اور پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

”تم یہاں گھومنے پھرنے سیاحت کا شوق پورا کرنے آئی تھی نا یہی کہا تھا تم نے اماں کو۔ تمہاری کون سی بات پر یقین کیا جائے۔ کیسے کرواؤ گی اماں سے اپنا اصل تعارف کہ تم اس شخص کی بھتیجی ہو جس کا ذکر بھی سننا گوارا نہیں کرتیں۔ اس گھٹیا ذلیل آدمی نے تم کو اپنی وکالت کرنے کیلئے بھیجا ہے۔ اب کیا ضرورت پیش آ گئی ہے اسے ہمدردی۔ یا پھر یہ دیکھنے کیلئے آئی ہو کہ ہم کس حال میں رہ رہے ہیں۔ اس بے غیرت کو جا کر بتانا کہ تم نے تو میری ماں کو ٹھکرا دیا تھا۔ دھتکار دیا تھا مگر یہاں آ کر دیکھو کہ لوگ کس طرح اس کے راستوں کو چومتے ہیں۔ کتنی عزت و تکریم سے پیش آتے ہیں۔ میری ماں نہ تو اس وادی کی سردار ہے نہ بہت بڑے جاگیردار کی بیٹی

اس کے باوجود وہ اس بستی کے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہے۔ اسے بتانا کہ پشمینہ خانم آج بھی اسی شان سے جی رہی ہے اور یہ کہ تم صرف اور صرف اس کانٹے کی مانند ہو جو اذیت دیتا ہے چبھن دیتا ہے اور جس نے پشمینہ خانم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لی ہے۔''

''نہیں شاہ نور پلیز اس لہجے میں میرے چاچو کا ذکر مت کرو۔ تمہیں نہیں پتا کہ وہ کتنا عظیم شخص ہے۔ اس جیسی محبت تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی زندگی کو' اس کے دل کو تو ایک وعدے نے دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ تم نہیں جانتے شاہ نور کہ وہ پچھلے اٹھائیس سالوں سے تم لوگوں کی یاد میں تڑپ رہا ہے۔'' رحاب نے بے قراری سے کہا۔

''اس کی سزا بھی یہی ہے کہ وہ تڑپتا رہے سلگتا رہے۔'' شاہ نور نے نفرت سے کہا تھا اور پھر کچھ پل اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد اسی کھردرے' سخت نفرتوں سے لبریز لہجہ میں بولا۔

''تم یہاں سے چلی جاؤ رحاب! ورنہ......''

رحاب بھیگی پلکوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی اٹھی اور شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی بہت دور نکل گئی تھی۔ شاہ نور دھندلائی نظروں سے اس کی پشت کی طرف دیکھتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔

''میں کیسے ناتا جوڑ لوں تم سے رحاب کہ تم اس شخص کی بھتیجی ہو جس نے میری ماں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جو میرے بچپن میری معصومیت کا قاتل ہے۔ جس نے سوائے دکھوں کے ہمیں کچھ نہیں دیا اور جو میرے وجود سے ہی انکاری تھا۔ جس نے مجھے اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں کیا تھا اور جس نے میرے نانا کو خط لکھ کر میرے ماں کے کردار پر کیچڑ اچھالا تھا۔''

وہ ساری رات گھر نہیں آیا تھا اور رحاب آخری مرتبہ جانے سے پہلے اس سے ملنا چاہتی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ پری چہرہ کے ہمراہ ڈیرے پر آ گئی تھی۔ شاہ نور نے اسے دیکھتے ہی منہ موڑ لیا تھا۔

''شاہ نور! کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟ اپنے باپ سے نہیں ملو گے۔ ان کے سینے سے نہیں لگو گے۔'' رحاب نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔

''کل میں نے گھر فون کیا تھا۔ ماما بتا رہی تھیں کہ چاچو کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسپتال میں ہیں وہ۔ چاچو مجھے یاد کر رہے ہیں وہ تمہیں بھی یاد کر رہے ہیں۔ ان کی اس اذیت کو ختم کر کے ایک مرتبہ مل لو ان سے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے سامنے...... پلیز شاہ نور اتنے پتھر دل مت بنو۔ میرے ساتھ چلو اگر دیر ہو گئی تو مسافر اپنے آخری سفر پر نکل جائے گا۔ آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ مجھے تنہا دیکھ کر ان کا کمزور بیمار دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔'' رحاب نے گڑگڑاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ شاہ نور اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''تمہیں اس محبت کی قسم جو تم مجھ سے کرتے ہو۔'' وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔

''یوں مت کرو شاہ نور! مجھے نامراد مت لوٹاؤ......'' رحاب کے آنسو اس کے قدموں پر گر رہے تھے۔ اس نے بے بسی سے رحاب کے جھکے سر کی طرف دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے رخ موڑتا واپس چلا گیا تھا۔ رحاب پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ اس کے ساتھ پری چہرہ بھی رو رہی ہے۔

''تم مت رو بی بی' ام کو بوت تکلیف ہوتا ہے۔ ام تم کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔ تم......تم ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے ام کو......'' پری چہرہ نے اس کے ہاتھ پکڑ کر التجا کی تھی۔ رحاب بے اختیار اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کا دل قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ پری چہرہ نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے اس کے گالوں پر بکھرے آنسو پونچھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ان حسین آنکھوں میں موسم ہجر گویا ٹھہر گیا تھا۔

''رحاب بیٹا! تم جا رہی ہو اتنی جلدی' ابھی تو تم نے دیامر کی کئی حسین وادیوں کی سیر بھی کرنا ہے۔ ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی ہے بیٹا!'' پری چہرہ نے خانم کو بتایا تھا کہ رحاب جا رہی ہے۔ خانم تو سنتے کے ساتھ ہی پریشانی کے عالم میں اس کے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔ رحاب بے دلی سے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ انہیں آتا دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''جی خانم' جانا تو ہے۔ ماما خفا ہو رہی تھیں اور پھر اتنے دن تو ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے۔ مہمان زیادہ سے زیادہ تین دن کا ہوتا ہے اور میں تو پھر بھی اتنے ڈھیر سارے دن آپ کے پاس رہی ہوں۔ اتنی تکلیف دی ہے آپ کو۔''

''لو بھلا تکلیف کیسی۔'' خانم خفگی سے بولی تھیں۔ ان کے بے حد اصرار پر بھی اس کی ناں ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

''یہ دن جو میں نے یہاں گزارے ہیں۔ میری زندگی کے انمول دنوں میں سے ہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی میں ان لمحوں کو یہاں پر گزاری صبحوں کو شاموں کو۔ آپ کی محبت اور مہمان نوازی کو۔'' وہ قدرے بشاشت سے بولی تھی۔ خانم نے اسے اپنے علاقے کی سوغاتیں اور بہت سے تحائف دیئے تھے۔

پری چہرہ اور زہرینہ نے اسے کانچ کی چوڑیاں دی تھیں۔ رحاب ان محبتوں کو محسوس کر کے نم آنکھوں سے مسکراتی رہی۔ دل میں اک حشر برپا تھا۔ آنکھ میں آنسو تھے جبکہ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

وہ پری چہرہ سے مل کر زہرینہ کی طرف بڑھی تو وہ بے اختیار رو دی تھی۔ ''ام تم کو روکنے پر قادر ہوتا تو کبھی بھی نہ جانے دیتا۔ تم بوت اچھا ہے بی بی' سب سے اچھا۔''

خانم نے پری چہرہ' زہرینہ اور گیٹ پر کھڑے خان نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ الوداعی کلمات کہے تھے۔ عرش نجانے کہاں تھی۔ اس کے جانے کی وجہ سے سب ہی غمگین اور افسردہ تھے سوائے عرش کے۔ وہ بے حد خوش اور مسرور تھی۔ اک بھاری بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اس لمحے عرش کے دل سے۔

گاڑی جانے پہچانے راستوں پر رواں دواں تھی۔ رحاب نے لب کچلتے ہوئے ان حسین نظاروں سے نگاہ چرائی۔ اس کے ذہن کے دریچوں پر فارم ہاؤس کی وہ گلابی شام گویا دستک دے رہی تھی۔

''یہ بتاؤ کہ لڑاکا بلی کی طرح کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہی تھیں۔ آنا فاناً جانے کا فیصلہ۔'' شاہ نور آنکھوں میں ڈھیروں شرارت لئے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ رحاب نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار مسکرا دی۔

''ہاں تو کیا چور ڈکیت کا الزام سن کر بھی رکی رہتی۔ مجھے بہت افسوس ہوا تھا کہ تم میرے بارے میں ایسا سوچتے ہو۔ کب جائے گی رحاب؟ اتنے بے زار تھے مجھ سے۔'' اس نے شاہ نور کے لہجے کی نقل اتاری۔

''تم نے اماں کی باتیں سن لی تھیں بے وقوف کچھ دیر اور رک کر میرا جواب بھی سن لیتیں۔'' شاہ نور نے قہقہہ لگایا تھا۔ رحاب نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ویسے ''چورنی'' تو تم ہو ہی' میرے دل کو چرا لیا ہے تم نے۔'' وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ رحاب نے چونک کر ارد گرد دیکھا۔ وہ اس کی آواز کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے گہرا سانس خارج کر کے تمام سوچوں کو جھٹکا اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دی اور ابھی تو اس نے ماہا کے سوالوں کیلئے بھی خود کو تیار کرنا تھا۔ وہ کیسے ماہا کو بتائے گی کہ اس کا یہ سفر رائیگاں گیا ہے۔ اس مسافت نے اسے اک نئے درد سے آشنا کرنے کے سوا کچھ نہیں دیا۔

☆☆☆

''آنٹی! میں آ جاؤں۔'' عرش نے خانم کے کمرے میں جھانک کر کہا تھا۔

''ہاں بیٹے کیوں نہیں......''

''شاہ نور کہاں ہے۔ آنٹی۔'' وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''شہر گیا ہے۔'' وہ مختصر بتا کر کپڑے تہہ کرنے لگی تھیں۔ عرش بدمزا سی ہو کر اٹھ گئی۔ انہوں نے اپنے کپڑے سمیٹ کر الماری میں رکھے اور شاہ نور کے کپڑے اس کے کمرے میں رکھنے کیلئے چل دیں۔ کمرے کی حالت کافی ابتر تھی۔

''لگتا ہے پری چہرہ نے صفائی نہیں کی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگی تھیں۔ بیڈ شیٹ بدلی' جوتے موزے اٹھائے' تولیہ دھوپ میں پھیلایا۔ کتابیں اٹھا کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھیں۔ اسی پل ان کی نگاہ سیاہ جلد والی اس ڈائری پر پڑی تھی۔ انہوں نے کچھ حیرانی کے عالم میں سے اٹھایا۔ ڈائری کے ساتھ بہت سے منی آرڈر کی رسیدیں اور ڈھیر سارے خطوط پڑے تھے۔ ان کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔ ڈائری کے اوپر بڑے بڑے حروف میں لکھے ''پشمینہ فراز'' کے حروف دیکھ کر وہ گویا ساکت رہ گئی تھیں اس قدرے بوسیدہ ڈائری کو سینکڑوں' ہزاروں ڈائریوں میں سے وہ پہچان سکتی تھیں۔ یہ ڈائری فراز کی تھی اور اس پر نام انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔

''یہ ڈائری یہاں کیسے آئی ہے'' انہوں نے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔ ان کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ انہوں نے رحاب کو شاہ نور کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی تھی اور سفید رنگ کا لفافہ بھی تھا۔

''تو کیا رحاب نے یہ ڈائری یہاں رکھی ہے'' انہوں نے وحشت زدہ ہو کر لرزیدہ ہاتھوں سے ڈائری کو کھولا۔ ڈائری میں موجود ان کی اور فراز کی شادی کی تصویر کون کون سے زخم ادھیڑ گئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ آنکھوں سے دو موتی ٹوٹ کر گرے تھے۔ انہوں نے آنکھوں میچ کر گویا ماضی سے نگاہ چرانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اک فلم سی تھی جو ذہن کی اسکرین پر چلنے لگی تھی۔

وہ پہلی مرتبہ بابا کے ہمراہ ایبٹ آباد آئی تھی۔ بابا کے دوست رب نواز نے بہت اصرار کے ساتھ انہیں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی بلکہ رب نواز نے تو بابا کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ پشمینہ ان کے گھر رہ کر پڑھے۔

نواز چچا کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑی گل مینا تھی۔ پشمینہ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئی تھیں۔ ان کی دوستی میں زیادہ ہاتھ گل مینا کا تھا۔ پشمینہ مزاجاً کم گو تھی جبکہ گل مینا اس کے برعکس انتہائی شوخ اور چنچل مزاج کی لڑکی تھی۔

جب بابا نے اس کا شہر کے سب سے بہترین کالج میں ایڈمیشن کروایا تو پشمینہ کو ایجوکیشن کا سنتے ہی گھبرا اٹھی۔

''گل! میں اکیلے کیسے کالج جاؤں گی۔''

''کیا مطلب پورے شہر کو ساتھ لے کر جانا ہے تمہیں۔'' گل مینا مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جھنجلا اٹھی۔

''میرا مطلب ہے کہ میرا تو وہاں نہ کوئی جاننے والا ہوگا اور نہ ہی کوئی دوست۔'' اس نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔

''دوست بناؤ گی تو بنیں گے۔ جاتے ہی ڈیڑھ انچ کی علیحدہ سے مسجد بنا کر نہ بیٹھنا۔'' گل مینا نے اسے سمجھایا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا گل کہ تم بھی میرے والے کالج میں ایڈمیشن لے لو۔'' گل مینا نے کچھ حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر قدرے تلخی سے بولی۔

''میرے باپ کے پاس نہ اتنا پیسہ ہے اور نہ ہی وسائل ہیں کہ مجھے اتنی مہنگی تعلیم دلوا سکے۔''

''یہ تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے میں بابا سے کہتی ہوں وہ تمہارا بھی اسی کالج میں داخلہ کروا دیں۔'' پشمینہ نے چٹکی بجاتے ہوئے حل پیش کیا تھا گل مینا نے اسے روکنے کی سرسری سی کوشش کی تھی۔ پشمینہ نے اپنے بابا سے ذکر کیا تو انہوں نے بغیر برا منائے گل مینا کے ایڈمیشن کی بھی کوششیں شروع کر دیں۔ نواز چچا کے منع کرنے اور ناراضی کے باوجود پہلے دن جب وہ دونوں کالج گئیں تو وہ دونوں کی ہی کیفیات مختلف تھیں۔ پشمینہ اگرچہ بہت با اعتماد لڑکی تھی مگر اک مختلف ماحول کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی تھی جبکہ گل مینا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کا برسوں کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کرنے کے باوجود وہ اپنے من پسند تعلیمی ادارے میں داخلہ نہیں لے سکتی تھی وجہ وہی غربت تھی جو اسے ہر چیز سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اب

پشمینہ کے توسط سے اس کی دلی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ پہلی کلاس تعارفی تھی اگلے دو دن بعد باقاعدہ پڑھائی شروع ہوگئی۔

چوتھے دن وہ سر عارف کا لیکچر بہت غور سن رہی تھی جب ان کی کلاس میں ایک اور اسٹوڈنٹ کا اضافہ ہوا۔ جب وہ کلاس روم میں داخل ہوا تو سب سے پہلے گل مینا ہی نے اس کی طرف دیکھا تھا جبکہ پشمینہ نوٹ بک پر جھکی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے کلاس روم میں داخل ہونے کے بعد پوری کلاس میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ اتنا خوبصورت تھا کہ گل مینا سمیت کئی لڑکیاں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے گئیں۔

''اپنا سویٹ نیم تو بتاؤ'' سر کے باہر نکلتے ہی پیچھے سے آواز آنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔

''ایکدفعہ پھر پوری کلاس باجماعت کہے۔'' وہ پوری کلاس کو نگاہوں میں مقید کئے بولا پوری کلاس نے اپنا سوال پھر سے دہرایا تھا۔ پشمینہ نے نوٹ بک بند کر کے بے حد حیرانی سے کلاس میں گونجتے شور اور سامنے کھڑے لڑکے کو کانوں میں انگلیاں ٹھونسے مسکراتے دیکھا۔

''پلیز۔ پلیز'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پوری کلاس نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ پشمینہ نے گل کو ٹہوکا دے کر پوچھا کہ بات کیا ہے۔گل مینا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے فراز سکندر کہتے ہیں'' اس نے سر کو تھوڑا سا جھکا کر کہا۔

''کون سکندر؟'' چلبلی سی ثانیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ہی جس نے دنیا فتح کی تھی۔'' آخری رو میں بیٹھے ناصر نے بلند آواز میں کہا تھا۔ پوری کلاس میں قہقہوں کا طوفان ابل پڑا۔

''آپ یونان سے تو نہیں آئے ہیں۔'' ثانیہ نے آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت سے دریافت کیا۔

''نہیں جی میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔'' فراز نے لب و لہجے میں انکساری بھر کر کہا تھا۔ پوری کلاس نے فرداً فرداً اس سے تعارف حاصل کیا تھا۔فراز ان سب کے سوالوں کے برجستہ جواب دیتا رہا۔ اس کی نظریں کونے میں بیٹھی خاموش سی پشمینہ پر تھیں۔

سر نبیل کا پریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد وہ اور گل مینا کینٹین کی طرف جا رہی تھیں۔ جب فراز نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بے حد دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''آپ کی بے نیازی بہت پسند آئی ہے۔'' پشمینہ نے ٹھٹک کر اس کی پشت کو دیکھا تھا۔گل کے قدموں کو بھی بریک لگ گئے تھے جبکہ پشمینہ گل کی طرف دیکھ کر خفت زدہ ہوگئی۔

فراز نے پہلی مرتبہ پشمینہ کو براہ راست مخاطب کیا تھا اور پھر کالج کے چار سالوں میں بھولے سے بھی پشمینہ اور فراز کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی جبکہ گل مینا کی اس کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ آپس میں باتیں کرتے کرتے جھگڑتے بھی تھے مگر فراز نے کبھی بھی پشمینہ کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان

دونوں کے درمیان گویا خاموش معاہدہ طے پایا تھا کہ گل مینا جیسی تیز طرار لڑکی بھی محسوس نہیں کر پائی تھی۔

فائنل ایگزامز ہونے سے پہلے فراز چند دن کالج نہ آیا تو گل مینا کافی متفکر ہوگئی تھی اس کا ارادہ تھا کہ فراز کی خالہ کے گھر جا کر معلوم کیا جائے کہ وہ غائب کہاں ہے۔ مگر پشمینہ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ گل مینا بہت سے دن صرف اور صرف اسی بات پر اس سے خفا خفا سی رہی تھی پھر جس دن فراز کالج آیا تو گل مینا فوراً ہی اس سے ملنے پہنچ گئی تھی۔

ساتھ پشمینہ کو بھی اس نے گھسیٹ لیا۔

''کہاں تھے تم اتنے دنوں سے؟''

''میں اسلام آباد گیا ہوا تھا'' اس کی نگاہیں پشمینہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''کیوں؟'' گل مینا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''اپنی امی جان کو منانے۔''

''کیا مطلب۔'' گل مینا الجھی۔

''اصل میں میرا یہاں رہنا انہیں پسند نہیں ہے۔ بہت مشکل سے میں نے امی جان کو منا کر یہاں ایڈمیشن لیا تھا۔ اب ان کا اصرار ہے کہ میں واپس آ جاؤں اور یونیورسٹی لیول کی تعلیم اپنے شہر ان کے پاس رہ کر حاصل کروں جبکہ میرا دل یہیں کہیں الجھ کر رہ گیا ہے۔ کمبخت مانتا ہی نہیں' تم ہی بتاؤ کیا کروں میں۔'' وہ بات گل مینا کے ساتھ کر رہا تھا اور دیکھ پشمینہ کی طرف رہا تھا۔ گل مینا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''تم اپنے دل کی مان لو۔''

دل اور دماغ کی جنگ میں دل جیت گیا تھا۔ ان تینوں نے اسی کالج سے ایم اے کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کی امی نے سنا تو پہلی فرصت میں ایبٹ آباد چلی آئیں۔ دونوں ماں بیٹے کے درمیان خوب تکرار ہوئی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ضد پر اڑے رہے آخر امی جان نے ہار تسلیم کر کے دو سال مزید دوری برداشت کرنے کیلئے خود کو تیار کر لیا۔ انہیں فراز اپنے تینوں بیٹوں میں سب سے زیادہ پیارا تھا۔ انہوں نے اس کی ہر جائز ناجائز بات مانی تھی اب بھی اس کی شدید خواہش کا احترام کر کے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

اسے پشمینہ سے محبت ہوگئی تھی اور پشمینہ کو اس سے۔ فراز نے سب سے پہلے خالہ کو ہی پشمینہ کے متعلق بتایا تھا۔

ابھی وہ لوگ فرسٹ سمسٹر کے ایگزامز دے کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ پشمینہ کے بابا کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔

جب وہ ان کی عیادت کیلئے ہسپتال گیا تو وہ اپنے دوست رب نواز کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

''میرے بعد میری بچی کا کیا ہوگا نواز' اس دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہیں سوائے میرے' اگر میں نہ رہا تو میری پشمینہ کہاں جائے گی۔'' رب نواز انہیں تسلیاں دلاسے دے رہے تھے۔ فراز نے سلام کیا اور تو رب نواز

نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

''تم اپنے بیٹے کاشف سے پشمینہ کا نکاح کر دو۔ میں اس کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا' کیا خواب دیکھے تھے اپنی اکلوتی بیٹی کے متعلق سب ٹوٹ گئے۔ پتا نہیں میں زیادہ دیر تک جی پاؤں گا یا نہیں۔ یہ کہاں جائے گی۔ رب نواز تم سن رہے ہو نا۔'' انہوں نے بھرائی آواز میں کہتے ہوئے رب نواز کے ہاتھ تھام لئے۔ رب نواز نے اک نظر فراز پر ڈالی اور پھر دبی آواز میں بولے۔

''پر کاشف تو پشمینہ سے کافی چھوٹا ہے۔''

''چار پانچ سال کی چھوٹائی بڑائی کوئی معنی نہیں رکھتی' تم بتاؤ کیا کہتے ہو۔''

''اچھا تم ٹھیک ہو جاؤ پھر دیکھتے ہیں۔'' رب نواز نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ فراز سے ان کے چہرے پر پھیلی مایوسی دیکھی نہیں گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی بول پڑا تھا۔ یہ خواہش تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور دلی خوشی تھی۔ دل شیر خان نے حیرانی سے اس خوبصورت نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی موجودگی سے ابھی تک بے خبر تھا۔

''میں اور پشمینہ ایک دوسرے پسند کرتے ہیں۔'' رب نواز کے جانے کے بعد وہ دھیمے مگر پراعتماد لہجے میں بولا تھا۔ اسی ہسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ان دونوں کا بے حد سادگی سے نکاح ہوگیا تھا۔ رب نواز نے گھر آ کر ساری کارروائی کی خبر بیوی کو دی تھی۔ گل مینا نے سنا تو ششدر رہ گئی۔ اس کے خواب کانچ کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ وہ ساری رات اس نے رونے تڑپتے گزار دی۔

اس نے جسے چاہا' پوجا وہ کسی اور کا ہو گیا تھا اس کڑوی حقیقت کو اس نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا تھا' وہ اب بھی فراز پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

''تم میرے نہیں ہو سکے تو پشمینہ کے بھی نہیں رہو گے۔'' رات کے چار بجے ٹھنڈے پانی کے چھپاکے منہ پر مارتے ہوئے اس نے نفرت سے سوچا۔

تیسرے دن وہ خوب تیار ہو کر صبح صبح پشمینہ کی طرف آ گئی تھی۔ فراز ناشتہ کر رہا تھا اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔

''کالج نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں' آج کا دن پشمینہ کے ساتھ گزاروں گی اور خالہ امی کی کمپنی انجوائے کروں گی۔'' اس نے مصنوعی بشاشت سے کہا۔

''اچھا تم ناشتہ کرو میں پشمینہ کو جگاتا ہوں۔'' فراز کرسی گھسیٹ کر اٹھ گیا اور وہ بے قراری کے عالم میں اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ کچھ پل بعد پشمینہ چلی آئی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کے حسین مکھڑے اور نیلی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈوروں کو دیکھتی رہی۔ کچی نیند کا خمار ہیروں کی طرح دمکتی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ وہ بڑی چاہت سے گل مینا سے ملی تھی۔

''شکر ہے کہ اتنے دن بعد تمہیں میرا خیال تو آیا ہے۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے شکوہ کیا۔

''اتنے دن کہاں صرف تین دن ہی تو گزرے ہیں۔'' میرا شہر دل اجڑا ہے۔ تین دن کا سوگ تو بہت تھوڑا ہے۔ یہ درد بھلانے میں تو زمانے گزر جائیں گے۔ میں کیسے تمہیں ہنستا بستا دیکھ پا رہی ہوں' اگر تم میرے دل میں جھانک لو تو ساکت رہ جاؤ۔ ابھی تلک صف ماتم بچھی ہے۔

''ارے کہاں گم ہو گئیں۔ اٹھو ناشتہ کر لیں۔ قسم سے بہت بھوک لگی ہے۔'' اسے گہری سوچوں میں گم پا کر پشمینہ نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ خالہ امی کو ناشتہ دینے کے بعد اس نے گل مینا کے من پسند قیمے والے پراٹھے بنائے اور چائے کپوں میں انڈیل کر باہر چلی آئی۔

''بابا کی طبیعت کیسی ہے؟''

''پہلے سے کچھ بہتر ہیں۔ رات دو بجے کے قریب فراز لے کر آئے ہیں مجھے ہسپتال سے۔ بابا کی وجہ سے اتنی ٹینشن سے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ نجانے اگلے پل کیا ہوگا'' وہ بھرائے لہجے میں بولی تھی۔ گل مینا نے اطمینان سے کپ لبوں سے لگایا اور پھر اس کے چہرے کی دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی۔

''ابھی تو تم بابا کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہو اور اتنی جلدی ہمت بھی ہار رہی ہو۔ کل کو جب فراز کی ماں کی طرف سے ٹینشن ملے گی تب کیا کروں گی کیا تم نے فراز کی ماں کے ردعمل کے بارے میں سوچا ہے؟ اچانک' چوری چھپے شادی کر لینے کے جرم میں وہ تم دونوں کو معاف کر دیں گی؟'' گل مینا کے چبھتے سوال نے ایک پل کیلئے اسے متوحش کر دیا تھا تاہم دوسرے ہی لمحے وہ قدرے اطمینان سے بولی۔

''یہ فراز کا ہیڈک ہے۔ یہ کس طرح اس معاملے کو سلجھائیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے جب تک ان کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی وہ اپنی امی کو شادی کے متعلق نہیں بتائیں گے۔ خالہ امی نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔'

''چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کالج کب سے آنا شروع کرو گی۔'' گل مینا نے موضوع بدلتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

''بابا کی طبیعت کچھ سنبھل لے پھر دیکھوں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔ اسی پل فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ دوسری طرف فراز تھا۔ پشمینہ اس کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تو پشمینہ کے انتظا۔ میں بیٹھی رہی تھی پھر بے دلی سے اٹھ کر خالہ امی کے کمرے میں چلی گئی۔ خالہ امی کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ واش ردم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ گل مینا یونہی وقت گزاری کیلئے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔ تکیے کے اوپر فون نمبرز والی ڈائری رکھی تھی۔ اس نے نہایت احتیاط سے ڈائری کو اٹھا کر کھولا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے مطلوبہ نمبر مل گیا تھا۔ وہ اٹھی اور اسی طرح دبے قدموں سے باہر چلی گئی۔

''ضروری نہیں کہ ہمیشہ جیت تمہاری ہو اور سب کچھ تمہیں ہی مل جائے دولت' ذہانت اور محبت' پہلی دو چیزیں تم سے چھیننا میرے اختیار میں نہیں آخری چیز تو میں تم سے چھین کر رہوں گی'' گل مینا نے زہرخند لہجے میں کہا۔

اسے ابھی تک یاد تھا کہ وہ لوگ کب' کس وقت اور کیوں پشمینہ کے گھر گئے تھے۔ آج سے سات برس پہلے وہ اور ابا دونوں ان کے بہت ہی پیارے دوست دل شیر خان کے گاؤں گئے تھے۔ دل شیر خان کا گاؤں گویا جنت کا خطہ معلوم ہوتا تھا۔ اتنا حسن اس قدر دلکش گل مینا کھوئی کھوئی سی آس پاس کے مناظر دیکھتی رہی۔ دل شیر خان کا گھران کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ قیمتی فرنیچر' کمروں میں بچھے قالین نوکر چاکر۔

دل شیر خان کے پھلوں کے بہت سارے باغات تھے۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں ہمیشہ ڈھیروں کے حساب سے فروٹ آتے دیکھا۔ خشک میوہ جات کے علاوہ انگور' آڑو' سیب اور ناشپاتی کے ٹوکرے اور کریٹ آیا کرتے تھے۔

پہلے پہل وہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ اس کے ابا ڈھیروں کے حساب سے پھل ان کیلئے لایا کرتے ہیں مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ ابا کے دوست دل شیر خان اپنے گاؤں کی سوغاتیں بطور تحفہ ان کو بھیجتے ہیں۔ نجانے کیوں اسے دل شیر خان کی ان نوازشات سے چڑ ہونے لگی تھی۔

اس کے ابا کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ قدرے سنسان علاقے میں بنی اس دکان سے کوئی شاذ و نادر ہی سودا لینے آیا کرتا تھا۔

پھر ایک مرتبہ ایسی طوفانی بارش برسی کہ نا صرف ان کے چھوٹے سے دڑبا نما مکان کی دیواریں ہل گئیں بلکہ دکان کی چھت بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ ساری رات بارش برستی رہی تھی۔ صبح جب ابا نے دکان کا دروازہ کھولا تو ہر چیز پانی میں ڈوبی نظر آئی۔ ابا ان حالات کو دیکھ کر بے حد غمگین اور پریشان تھے۔ اماں کے مشورے نے ابا کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ وہ دوسرے ہی دن بیٹی کے ہمراہ ''بسری'' روانہ ہوئے۔

دل شیر خان اپنے عزیز از جان دوست کو دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی بے انتہا خاطر مدارات کی۔ کھانا کھانے کے بعد ج وہ سبز چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تب پشمینہ چلی آئی تھی۔ دل شیر خان نے اپنی بیٹی کا ان سے تعارف کروایا۔

''گل مینا بیٹے' یہ میری بیٹی پشمینہ خانم ہے۔ بہت ہی لائق ذہین اور دلیر'' ان کا تعارف کروانے کا انداز بہت پیارا تھا۔ گل مینا کو وہ انتہائی مغرور' نک چڑھی سی لگی تھی۔

''اللہ بھی بعض لوگوں کو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔'' اس نے سلگتے ہوئے سوچا۔ وہ آج کل ویسے بھی بے حد چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ دل شیر چچا کی آن بان اور شان و شوکت دیکھ کر اس کے دل میں ڈھیروں نفرت کے ساتھ بے زاری بھر آئی۔ رہی سہی کسر پشمینہ کے رویے نے پوری کر دی تھی۔

''ابا! واپس چلیں۔'' وہ دوسرے ہی دن قدرے تلخی سے ابا سے مخاطب ہوئی تو وہ پہلے حیران ہوئے اور بعد میں انہوں نے اسے اچھا خاصا ڈانٹا بھی۔

''میں جس کام کیلئے آیا ہوں وہ تو کرلوں پھر چلتے ہیں۔''

وہ لوگ چار دن دل شیر چچا کے گھر رہے تھے۔ اس دوران پشمینہ اپنے کمرے میں ہی بند رہی تھی۔

ابا جس کام کے سلسلے میں دل شیر چچا کے پاس آئے تھے وہ نہیں ہو سکا تھا۔گل مینا نے سنا تو غصے اور اہانت کے احساس سے برا حال ہو گیا۔ وہ ابا سے جھگڑ پڑی تھی۔ ابا بھی بہت پریشان ہو گئے تھے۔ رات کو انہوں نے دل شیر سے کچھ قرض مانگا تھا۔ پہلے تو وہ کافی دیر خاموش رہے پھر جب بولے تو ان کے لب و لہجے میں شرمندگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''چند دن پہلے تم آ جاتے یا پھر مجھے پیغام بھجوا دیتے تو میں تمہارے لئے کچھ پیسے الگ کر دیتا۔ زر ولی کی دو بیٹیوں کی شادی تھی۔ میرے پاس جو رقم محفوظ تھی وہ میں نے اب بچیوں کے جہیز کیلئے دے دی ہے۔ صرف یہی معمولی سی رقم اس وقت میرے پاس ہے۔ ابھی تم ان پیسوں سے کام چلاؤ۔ ڈیڑھ مہینے بعد میں گھر آ کر تمہیں پیسے دے جاؤں گا بس فصل اٹھانے کی دیر ہے۔'' انہوں نے دس ہزار روپے رب نواز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا اور پھر اپنے وعدے کے عین مطابق وہ دو لاکھ روپے ان کے گھر آ کر دے گئے تھے۔ مگر گل مینا کے دل سے یہ کانٹا کبھی بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر پشمینہ میٹرک کرنے کے بعد ایبٹ آباد...... چلی آئی تھی مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے۔ پشمینہ کی مہربانیوں کی وجہ سے ہی وہ اچھے ادارے میں پڑھتی رہی تھی۔ مگر نجانے کیوں، کب اور کیسے وہ پشمینہ سے متاثر ہونے کے بعد اس سے حسد کرنے لگی تھی۔

یہ حسد نفرت میں اس وقت بدلا تھا جب اس نے فراز اور پشمینہ کو ایک ہوتے دیکھا صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر بازی پلٹ گئی تھی۔ کالج میں وہ سارا دن اس کے ساتھ رہا تھا۔ گل مینا نے ہی اسے پشمینہ کے بابا کی خرابی طبیعت کے متعلق بتایا تھا۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ وہ دل شیر خان کی عیادت کرنے کیلئے جائے گا اور پشمینہ سے بندھن باندھ کر آئے گا تو وہ کبھی بھی اسے نہ بتاتی۔ اس نے تقدیر سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بے شک انسان نادان ہے اور اپنی نادانی میں وہ خسارے کا سودا کر لیتا ہے۔

گھر آ کر اس نے احتیاط سے پرس میں سے نمبر نکالا اور فون سیٹ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر دی تھا۔ ساتویں بیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔ گل مینا نے ریسیور مضبوطی سے پکڑا۔

''میں فراز کی ماں ہوں، آپ ہیں کون اور مجھ سے کیوں بات کرنی ہے؟'' گوہر بیگم نے اپنے مضبوط پر جلالی لہجے میں کہا تھا۔

''میں آپ کی خیر خواہ ہوں اور جو بات میں ابھی آپ کو بتانے والی ہوں۔ اسے غور سے سنئے گا اور چاہے تصدیق کیلئے یہاں ایبٹ آباد آ جایئے گا میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں یہ جو بھی کہوں گی سچ کہوں گی۔''

''بات کیا ہے؟'' گوہر بیگم نے کچھ سختی سے پوچھا تھا۔ ان کے لب و لہجے سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

''آپ کے بیٹے فراز نے پشمینہ نامی پہاڑی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ وہ لڑکی اس وقت آپ کی بہن کے گھر میں فراز کی بیوی کی حیثیت سے رہ رہی ہے مگر۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی۔'' گوہر بیگم کے سر پر گویا آسمان آن گرا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر چلا اٹھیں۔

''یہی سچ ہے۔ آپ کو اگر یقین نہیں آتا تو یہاں آکر دیکھ لیں۔''

''تم کون ہو؟''

''آپ کی خیر خواہ'' گل مینا نے مزید ان کے بولنے سے پہلے ہی فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ بے حد اطمینان کے ساتھ پلنگ پر دراز آنکھیں موندے گنگنا رہی تھی۔

گوہر بیگم نے جنون کے عالم میں بہن کے گھر کا نمبر ملایا تھا۔ بدقسمتی سے فون فراز نے ہی اٹینڈ کیا۔ ماں کے غیض وغضب سے بھرپور لہجے کو محسوس کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا تھا۔

''امی جان کیسی ہیں آپ۔''

''مرگئی امی' جہنم میں گئی۔'' دوسری طرف انہوں نے چلا کر کہا۔

''خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں۔ تو نے یہ کیا' کیا ہے فراز۔ میرے کانوں نے ابھی ابھی کیا سنا ہے۔ یقین نہیں آرہا مجھے۔ تم اس طرح نہیں کر سکتے۔'' وہ ٹوٹے لہجے میں بولیں۔

''تو نے بیاہ رچا لیا مجھے بتائے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر' تجھے شرم نہیں آئی بے غیرت۔ ابھی تو تم سے پانچ سال بڑا مہران کنوارا ہے۔ گھٹیا لڑکی کو ابھی اور اسی وقت چلتا کرو اسے۔ میرے آنے سے پہلے نکال دو اسے گھر سے۔ ورنہ' نہ میں اسے چھوڑوں گی نہ تمہیں۔'' وہ نفرت وحقارت بھرے لہجے میں غرائیں۔

''امی میری بات تو سنیں۔'' انہیں مسلسل چیختے اور واویلا کرتے سن کر وہ دبی آواز میں بولا تھا۔

''کیا سنوں' ہاں بتاؤ کون سی صفائیاں پیش کرو گے۔''

''امی پشمینہ کے بابا بہت بیمار تھے۔ اسی لئے اچانک ہی نکاح۔''

''بکواس نہ کرو۔ میرے سامنے ذلیل بے شرم اور بدچلن عورت کا ذکر مت کرو۔'' انہوں نے گرج کر کہا۔

''امی! پشمینہ میری بیوی ہے۔ اس کے متعلق ایسے گھٹیا الفاظ مت استعمال کریں۔'' وہ دھیمے لہجے میں انتہائی ناگواری سے بولا۔ خالہ امی کو آتا دیکھ کر اس نے ریسیور ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

''آپا! کیا ہو گیا ہے ذرا صبر وتحمل سے بات کرو۔''

''فریدہ! یہ ساری چال تمہاری ہی ہے۔ پہلے میرے بیٹے کو اپنے پاس پڑھائی کے بہانے رکھ لیا۔ اب اس کو ورغلا کر نہ جانے کس سے بیاہ کر دیا ہے تاکہ وہ ساری زندگی تمہارے پاس ہی رہے۔ اپنے بیٹے تو دونوں ہی باہر دفعان ہو گئے ہیں۔ بہت چالاک ہو تم' اپنی تنہائی دور کرنے کیلئے ہر غلط کام میں اس کا ساتھ دیتی رہی ہو۔ میں بھی کہوں میرا بچہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یقیناً تم ہی نے اسے مجبور کیا ہوگا۔'' گوہر بیگم اب ان پر گرجنے

برسنے لگی تھیں۔ وہ اپنی صفائی میں بولنے کیلئے الفاظ ہی تلاشتی رہ گئیں اور گوہر بیگم نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ پورا مہینہ اسی پریشانی اور ٹینشن میں گزرا تھا۔ پھر گوہر بیگم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تو فراز اور خالہ امی دونوں ہی اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

''تو اس کلموہی کے پاس نہیں جائے گا۔'' ہوش میں آنے کے بعد وہ فراز کے سینے سے لگی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ فراز بے بسی سے انہیں دلاسے دیتا رہا۔

فریدہ کو دیکھ کر ان کا پارہ ایک دفعہ پھر چڑھ گیا تھا۔ دونوں بہنوں میں زبردست قسم کی تکرار ہوئی اور اگلی سہ پہر فریدہ ایبٹ آباد سدھار گئیں۔ گوہر بیگم کی طبیعت سنبھلتے ہی فراز نے بھی کوچ کرنے کا سوچا۔ بھائی کو ہم راز بنا کر وہ بھی ایبٹ آباد چلا گیا تھا جب اس کے پہنچنے کے تیسرے دن گوہر بیگم نے تیز چاقو کے ساتھ اپنے ہاتھوں کی رگیں کاٹ لیں۔ ماں کی ایسی حالات دیکھ کر وہ ذہنی کرب و اذیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے اپنی جلد بازی پر رہ رہ کر غصہ آتا۔

پورے آٹھ دن بعد گوہر بیگم نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کی طرح ہی جذباتی تھیں۔ فراز کو دیکھ کر انہوں نے غصے سے منہ موڑ لیا۔

''امی جان پلیز یوں مت کہیں۔'' وہ ان کے قدموں میں سر رکھ کر رو دیا تھا۔

''نہ تو میرا فراز نہ میں تیری ماں۔ میرا اور تمہارا تعلق ختم۔'' وہ تکیے پر سر پٹختے ہوئے چلا رہی تھیں۔

''پورے خاندان والوں کے سامنے مجھے رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ تھو تھو کر رہے ہیں۔ اتنی ذلت اتنی رسوائی۔ میں جی کر کیا کروں گی' نہیں جینا مجھے اب۔'' انہوں نے ٹیبل پر رکھی دوائیوں کی شیشیاں اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔ فراز نے بمشکل انہیں بازوؤں سے پکڑ کر قابو کیا۔

''تو اب واپس گیا نا تو میں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی تمہیں۔ سن رہے ہو۔'' گوہر بیگم نے اس کے ہاتھ تھام کر سختی سے کہا۔ فراز سن سا کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''بول نہیں جائے گا نا۔'' وہ ایک دفعہ پھر چلائیں۔

''وعدہ کرو مجھ سے کہ ساری زندگی اس عورت کی شکل تک نہیں دیکھو گے۔'' انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے تھے۔

''آج کے بعد تم اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔'' گوہر بیگم کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ۔'' وہ اپنی ماں کے پیروں پر سر رکھے ٹوٹے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھیگتا جا رہا تھا۔

پشمینہ نے نہایت دلیری کے ساتھ تمام حالات کا جائزہ لیا اور فراز کی بے وفائی کے بعد بڑے حوصلے اور صبر کے ساتھ اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کیا۔ اسی دوران اس نے بے حد خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس نے

فراز سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر سوائے ناکامی کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ تھک ہار کر وہ اپنے چند ماہ کے بیٹے کو لے کر ہمیشہ کیلئے اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔

پشمینہ کے چلے جانے کے بعد بھی گل مینا نے فراز کے ساتھ رابطہ رکھا۔ خط و کتابت کے ذریعے وہ اسے جھوٹے سچے واقعات بتاتی رہی۔ پہلی مرتبہ جب اسے فراز کا خط ملا اور اس میں لکھی تحریر کو پڑھ کر کتنی ہی دیر ہنستی رہی تھی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''گل مینا! تم اسے بتانا کہ فراز نہ جھوٹا ہے نہ ہرجائی۔ میں نے راستہ نہیں بدلا' میں تو آج بھی اسی مقام پر تنہا کھڑا ہوں۔ کتنے ہی طوفان آئے اور مجھے چھو کر گزر گئے مگر میرے دل کو بدل نہیں پائے۔ یہ آج بھی اسی کا نام لیتا ہے۔ اس کی طلب کرتا اس کی یاد میں روتا ہے۔''

گل مینا نے کتنی ہی مرتبہ اس تحریر کو پڑھا تھا اور پھر خط کو پرزے پرزے کر دیا۔ تقریباً دس دن بعد فراز نے منی آرڈر کے ذریعے پچاس ہزار روپے بھیجے تھے۔ اس نے نہایت سفاکی سے رقم وصول کر کے خود پر خرچ کر دی۔ یہ سلسلہ ابھی تک چل رہا تھا۔ ہر مہینے فراز باقاعدگی کے ساتھ پیسے بھیجتا رہا اور گل مینا اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہی۔ وہ یہ رقم گل مینا کے نام بھیجتا تھا تاکہ وہ اسے پشمینہ تک پہنچا دے۔ وہ پشمینہ سے نفرت کرتی تھی اور اس نفرت نے اسے انتہا پسند بنا دیا تھا۔ پھر اس نے دل شیر خان کے نام خط لکھا' یہ خط اس نے فراز کی طرف سے لکھا تھا۔

اس خط میں اس نے پشمینہ کے کردار پر کیچڑ اچھالا' اس کے بچے کو کسی اور کی اولاد کا طعنہ دے کر اس نے اپنی طرف سے ان دونوں کو بدظن کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اسے اس معاملے میں کامیابی بھی ہوئی۔ اپنی بیٹی کے متعلق اتنے گھٹیا نازیبا الفاظ پڑھ کر دل شیر خان کو دوسرا اٹیک ہوا۔ باقی کی زندگی انہوں نے بستر پر تڑپتے گزاری تھی۔ ان سب کی زندگیوں میں زہر گھولنے والی بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا اسٹیٹس ہائی کر رہی تھی۔ اس نے بینک میں جمع شدہ رقم سے گھر خریدا' گاڑی لی پھر اس کی بہت اچھی فیملی میں شادی بھی ہوگئی۔

ادھر گوہر بیگم نے بڑی بہن کے ساتھ معاملات طے کر کے فراز اور ناعمہ کی شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔ فراز کی ضد' اس کی التجاؤں اور رونے گڑگڑانے کو وہ کسی خاطر میں نہیں لائی تھیں۔ وہ تو ناعمہ عین بارات والے روز گھر سے بھاگ گئی تھی۔ یوں فراز نے خود ہی بلا ٹل جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ گوہر بیگم اتنی ذلت و رسوائی کے بعد بھی ویسے ہی اکڑی رہیں۔ کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے مہربان کی شادی نہایت دھوم دھام سے کی تھی۔ پھر جب تک وہ زندہ رہیں ان کا غرور تکبر اس طرح قائم و دائم رہا۔

اور بعض لوگوں کو اللہ اسی طرح غافل رکھتا ہے اور وہ اسی غفلت میں گناہ پر گناہ کئے جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں اور عقل پر پردے جبکہ دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ گوہر بیگم اور گل مینا انہی لوگوں میں سے تھیں جو زمین کا بوجھ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں
اک آنسو اس شخص کا' جو بے گانہ ہے
اک آنسو اس نام کا' جو ہم لے نہ سکے
اک آنسو اس دعا کا' جو پوری نہ ہوئی
ایک فضول سی بات کہ جو بیسود کہی
اک آنسو اس چہرے کا' جو یاد رہے
آنکھوں کے رستے جو دل میں اتر جائے
اک آنسو اس ٹھہرے لہجے کا
اک آنسو اس وہم کا' ذہن میں جو آیا
اک آنسو اس جھوٹ کا' جو اوروں سے کہا
پھیکی ہنسی سے کیسے قصہ ختم کیا
لمحہ لمحہ رات گزرتی جاتی ہے
قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں

فہمیدہ ریاض کی نظم نے ان کی قفل زدہ دل کو کھول کر قطرہ قطرہ پگھلا دیا تھا۔ وہ ڈائری کو سینے سے لگائے رو رہی تھیں۔ ان کے دائیں ہاتھ میں سفید کاغذ تھا جو ہوا کے زور سے پھڑپھڑاتا ہوا ان کی بے جان انگلیوں سے پھسل کر اڑ گیا۔ اندر آتے شاہ نور نے حیرانی کے عالم میں پہلے ماں اور پھر پیرو کے پاس گرے کاغذ کو دیکھا۔ اس نے جھک کر کاغذ کو اٹھا لیا تھا۔

''ڈیئر شاہ نور'' اس کی نگاہیں تحریر پر پھسلتی جا رہی تھیں۔

''میں جا رہی ہوں۔ اک نہ ختم ہونے والی اذیت' ہجر کا غم اور چند آنسو میرے ہم سفر ہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ہی اب باقی کی زندگی گزارنی ہے۔

میں کہاں سے چلی تھی اور میرا سفر کہاں آ کر ختم ہوا۔ اس مسافت نے میری جھولی میں کیا ڈالا ہے۔ یہ اک الگ داستان ہے۔

کچھ ایسی تلخ حقیقتیں جو میں تم کو بتانا چاہتی ہوں اگر تم میری بات سن لیتے تو مجھے اس تحریر کا سہارا نہ لینا پڑتا۔

میں تم کو فراز سکندر کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں جو کہ تمہارا بدنصیب باپ ہے۔ جو تمہارے نزدیک انتہائی گھٹیا' ذلیل اور بدترین شخص ہے۔ وہ فراز سکندر جس کے بغیر کسی بھی محفل کے رنگ اپنی چمک دمک کھو دیتے تھے۔ جو انتہائی زندہ دل اور خوش مزاج انسان تھا۔ جس کے دوستوں کی تعداد شاید خود اسے بھی نہیں معلوم نہیں تھی اور جسے تمہاری ماں پشمینہ خانم سے عشق تھا اور اس عشق کی آگ میں جلتے ہوئے اس نے اپنے اوپر

زندگی کی ہر خوشی حرام کر لی تھی۔ اس نے خود کو بند کمرے میں قید کر کے زندگی کے رنگوں سے نگاہ چرا لی تھی۔ صرف ایک عہد کو نبھانے کیلئے اس نے تم دونوں سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے اپنی ماں سے کیا وعدہ پورا کر دیا۔ پلٹ کر ان راستوں کی طرف کبھی دیکھا بھی نہیں۔

وہ ہی گھٹیا ذلیل شخص تمہارا نام لے لے کر زندگی کی بوجھل سانسیں پوری کر رہا ہے۔ وہ کبھی بھی تمہارے وجود سے غافل نہیں رہا۔ تم دونوں کی یادوں کے سہارے ہی تو وہ ابھی تک زندہ ہے۔

اسے تمہاری پیدائش کی خبر تمہاری گل مینا آنٹی نے دی تھی اور اس نے اپنے کمرے کو تمہاری خوشبو سے ہی مہکا لیا۔ اگر وہ تم دونوں کو بھلا چکا ہوتا تو ہر مہینے گل مینا آنٹی کے ایڈریس پر ڈھیروں روپے کیوں منی آرڈر کے ذریعے بھیجتا۔ تمہاری میز پر وہ تمام رسدیں پڑی ہیں ان پر لکھی تاریخیں دیکھ لو اور گل مینا آنٹی سے تصدیق بھی کر لو۔

میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے خانم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں صرف اور صرف خانم کو اور تم کو اصل حقیقت بتانے کیلئے آئی تھی۔ تم لوگوں کے دلوں پر جمی بدگمانی کی گرد جھاڑنا چاہتی تھی میں۔ گل مینا آنٹی نے مجھے تمہارا ایڈریس نہیں دیا تھا اور میری خوش قسمتی دیکھو کہ ان ہی گلیوں میں میرا تم سے ''ٹاکرا'' ہو گیا۔

نہ جانے کب' کیوں اور کیسے میں تمہیں چاہنے لگی تھی۔ تم سمجھتے ہو میں نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے میری محبت بھی ڈھونگ اور ڈرامہ ہے۔ تمہیں یقین دلانے کیلئے میں صرف اتنا کہوں گی کہ جب کبھی زندگی کے کسی موڑ پر فرصت کے لمحات میں میرے شہر میرے گھر کے آنگن میں آنا' تمہیں اسی مقام پر کھڑی نظر آؤں گی جہاں کبھی فراز چاچو نے عمر کی پونجی کو لٹایا تھا۔''

اس نے دھندلائی نظروں سے ایک مرتبہ پھر تحریر کو پڑھا اور پھر شکستہ قدموں سے چلتا ہوا ماں کے قریب آیا۔

''شاہ نور! مجھے اسلام آباد لے چلو۔'' پشمینہ کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

☆☆☆

عرش کی فون کال نے انہیں بے حد ڈسٹرب کر دیا تھا۔ جب کسی پل چین نہ آیا تو انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا آرڈر دیا۔

گھر سے وہ مکمل تیاری کر کے نکلی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ آج شام کو ہی عرش اور شاہ نور کا نکاح کر دیا جائے۔ وہ شاہ نور کو بہت چاہتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ وہ ہو بہو فراز کی تصویر تھا۔ جب وہ پڑھنے کی غرض سے ایبٹ آباد آیا تو ان کا بہت دل تھا کہ شاہ نور ان کے پاس رہے۔ لیکن نجانے کیوں اس نے ہاسٹل میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ انہوں نے شروع سے ہی عرش اور شاہ نور کے حوالے سے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ عرش کو بھی انہوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اسے شاہ نور کی بیوی ہی بننا ہے۔ اس لئے تو اس نے ڈاکٹر عمار کے پرپوزل کو ٹھکرا دیا تھا۔ بھلا ڈاکٹر عمار جیسے معمولی بندے کی حیثیت ہی کیا تھی کہ عرش اس سے ناتا جوڑ لیتی۔

عرش نے کل ہی انہیں بتایا تھا کہ رحاب نامی لڑکی دفع ہو گئی ہے لہٰذا آپ مطمئن ہو جائیں مگر وہ مطمئن ہی تو نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ان کا دل انجانے خدشوں سے بوجھل اور لرزیدہ تھا۔ عجیب سی بے چینی رگ جان کو کرب و اذیت سے ہم کنار کر رہی تھی۔

''یہ رحاب نامی لڑکی ہے کون' جو اچانک آئی بھی ہے اور چلی بھی گئی اور جس کی وجہ سے عرش اس حد تک پریشان تھی۔'' متفکر سوچوں نے انہیں بہت جلد تھکا دیا۔ انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکاتے ہوئے آنکھیں موندیں تو چھم سے اک نازک سا سراپا نگاہوں کے سامنے لہرایا اور ساتھ ہی کلک کے ساتھ کچھ روشن بھی ہوا۔ اگلے ہی پل وہ یوں سیٹ سے اچھلیں گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''رحاب' اسلام آباد۔ فراز کی بھیجتی۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

''گاڑی واپس موڑو۔'' انہوں نے چلا کر کہا تھا۔ اپنے ہی دھیان میں مگن بشیر نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

''بیگم صاحبہ کیا ہوا۔''

''سامنے دیکھو ٹرک آرہا ہے۔'' گل مینا نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا تھا مگر گاڑی بشیر کے کنٹرول میں نہیں رہی تھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔

☆☆☆

''آپ کی رحاب ہار گئی چاچو۔ ہار گئی۔'' وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھے بے تحاشا روتے ہوئے بولی تھی۔ فراز لرزتے ہاتھوں سے اس کے بالوں کو سہلاتے رہے۔ وہ ان کے ساتھ شاہ نور کی باتیں کرتی رہی تھی اور وہ پرنم مسکراہٹ لئے سنتے رہے جبکہ رحاب اب بھی رو رہی تھی۔ دل کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے سر جھکائے اٹھی اور لرزیدہ قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مگر دوسرے ہی پل وہ ایک دفعہ پھر ان کے کمرے میں موجود تھی۔

''چاچو! وہ آرہا ہے' شاہ نور آرہا ہے۔ چاچی بھی ساتھ ہیں۔'' وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ فراز ساکت نظروں سے اسے دیکھتے رہے اور وہ اس طرح قلانچیں بھرتی بھاگ گئی۔

''یہ رابی کیا کہہ رہی ہے۔ پشمینہ آرہی ہے' شاہ نور آرہا ہے میرا بیٹا۔ میری جان۔'' وہ زیرلب بڑبڑائے اور پھر بے ساختہ ہنس پڑے اور ہنستے ہی چلے گئے۔

''میں اپنے بیٹے سے ملوں گا۔'' انہوں نے حیرت سے سوچا۔

''پتا نہیں کب آئے گا وہ۔ آئے گا بھی یا نہیں' اتنے سالوں سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسے دیکھنے کیلئے تڑپ رہا ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے ایک دم ہی خاموش ہو گئے تھے ان کی نظریں سامنے دیوار پر لگی تصویر پر تھیں۔ یہ تصویر ان کی ماں کی تھی گوہر بیگم نے گویا بے حد ناراضی کے عالم میں بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔

''فراز! کیا تو اپنا عہد بھول گیا ہے۔''

انہوں نے بے بسی کے عالم میں سر کو جھٹکا اور بھرائی آواز میں بولے۔ ''نہیں ماں میں کچھ بھی نہیں

بھولا' سب کچھ یاد ہے مجھے۔ لفظ لفظ دل پر لکھا ہے۔ چاہوں بھی تو کھرچ نہیں سکتا۔ کچھ بھی نہیں بھلا سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔'' وہ ایک دم چلائے تھے۔

ان کے سر میں شدید درد کی ٹیسیں سی اٹھیں تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کراہے۔ وہ پچھلی کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں اور نیند نہ آنے کی وجہ سے سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے پانی سے بھرا گلاس اٹھایا اور دراز میں سے سلیپنگ پلز نکالیں۔

''مجھے کچھ دیر سو لینا چاہیے۔'' وہ ایک دفعہ پھر بڑبڑائے۔ تکلیف دہ زہریلی سوچوں نے انہیں ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''ماں! دیکھ لو۔ میں وعدہ خلاف نہیں۔ میں بد عہد نہیں۔ مگر میں اب اس وعدے کی پاس داری نہیں کر سکتا میں ایک مردے پر دو زندہ لوگوں کو نہیں مار سکتا۔''

شاہ نور اور پشمینہ نے جب سکندر ولا میں قدم رکھا تو اندر بے حد خاموشی تھی۔ وہ دونوں ہی آنکھوں کی نمی ایک دوسرے سے چھپاتے شکست خوردہ قدموں سے اندر کی طرف بڑھے۔ رحاب نے اندر آتے شاہ نور کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی پل خوشی سے چیخ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا آپ لوگ ضرور آئیں گے۔''

پشمینہ اک ٹرانس کے عالم میں چلتی ہوئی فراز کی کی طرف بڑھیں۔ ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ کر وہ بے تحاشا رو دی تھیں۔

''کیسی محبت کی تھی فراز کہ خود بھی سلگتے رہے مجھے بھی سلگاتے رہے۔'' وہ بے آواز روتے ہوئے بڑبڑاتی رہیں۔ فراز نے بے تابانہ دونوں کو گلے لگایا تھا۔

☆☆☆

اسلام آباد سے ''بسری'' تک کے سفر نے اسے بے تحاشا تھکا ڈالا تھا۔ تھکن کی وجہ سے انگ انگ دکھنے لگا تھا۔ کمر الگ اکڑ کر تختہ ہو رہی تھی۔ اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد بسری کی حدود شروع ہوئیں تو رحاب نے اطمینان سے بھرا سانس لیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب وہ یہاں سے جا رہی تھی تو اسے یہ یقین نہیں تھا کہ اب وہ کبھی بھی دوبارہ یہاں آئے گی اور وہ بھی اس طرح۔ اس نے اپنے وجود سے اٹھتی مہندی' ابٹن اور موتیے کے پھولوں کی دلفریب خوشبو کو محسوس کیا۔

چاچو سے ملتے ہی پشمینہ اپنے دائیں ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر رحاب کو پہنا آئی تھیں۔

''بھابی! رحاب اب میری بیٹی ہوئی۔ آپ اب اس کی نہیں ماہا کی فکر کریں۔'' ماما تو بے چاری حیرت اور خوشی کے احساس سے کچھ بول ہی نہیں پائی تھیں۔ پھر آناً فاناً سب کچھ ہی طے پا گیا تھا۔ ماما نے کچھ ڈرتے ڈرتے اس سے ذکر کیا تھا مبادا کہیں وہ انکار نہ کر دے مگر اس کے چہرے پر پھیلے رنگوں کو دیکھ کر خوشگوار

حیرت نے ان کو گھیر لیا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ اسے خود سے لپٹا کر پیشانی کو چوم لیا۔
شادی سے پہلے شاہ نور کی اس کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی وہ ایک دو مرتبہ آیا تھا اور وہ چاہ کر بھی اسے سے مل نہیں سکی تھی۔ ماما نے روایتی ماؤں کی طرح سخت پردہ کروایا تھا کبھی کبھی تو وہ جھنجلا اٹھتی۔
''آپ تو اس طرح مجھے چھپا رہی ہیں گویا شاہ نور نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔'' ماما اس کے یوں بے شرمی سے کہنے پر اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔
بدگمانیوں کی دھند دور ہوئی تو سارے منظر روز روشن کی طرح واضح اور صاف شفاف ہو گئے۔ گاڑی نجانے کب سیاہ گیٹ کے سامنے رکی تھی۔ سوچوں میں گم اس نے کچھ چونک کر دیکھا تھا۔ پھر نجانے کون کون سی رسومات ہوئیں۔ پری چہرہ' زہرینہ کے ساتھ پلوشہ کی چہکتی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔
''بی بی! تم بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔ ام تم کو لالا کی دلہن بنے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا ہے۔'' پری چہرہ نے اس کی حنائی نرم و گداز ہاتھ کو چھو کر بہت محبت سے کہا تھا۔
''تم بہت اچھا ہے بی بی۔ ام نے کتنی ہی دعائیں چپکے سے اللہ پاک سے مانگ ڈالی تھیں کہ تم ہمیشہ کیلئے امارے پاس آ جاؤ۔'' زہرینہ اس کے حسین روپ کو پیار سے تکتے ہوئے بولی تھی۔ اتنی بولڈ' منہ پھٹ سی رحاب اس پل شرم و حیا سے پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اسی پل پشمینہ دودھ کا باؤل لے کر آئیں جو انہوں نے رحاب کے سر سے وار کر کے پلوشہ کو پکڑا دیا تھا۔
''تم لوگ اب اٹھو رات بہت ہو گئی ہے اور رحاب بھی بہت تھکی ہوئی ہے جو باتیں رہ گئی ہیں صبح کر لینا۔''
''بہتر خانم۔'' وہ سب بیک زبان بولیں۔ خجستہ اور خوش بخت نے اسے تھام کر کمرے میں پہنچایا تھا۔
شاہ نور کے کمرے کو بہت ہی نفاست کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ سرخ گلابوں کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی تو خوشگوار احساس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ تین بجے کے قریب باہر کچھ ہلچل سی ہوئی تھی کچھ دیر بعد شاہ نور نپے تلے قدم اٹھاتا اندر چلا آیا۔ وہ جو نیند کے غلبے اور تھکن سے بے حال ہوتی نیم غنودگی میں تھی اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو اشتعال اور غصے سے اس کی بھنویں تن سی گئیں۔
''اب بھی نہ آتے۔'' اس نے بے حد غصے سے بغیر سوچے سمجھے کہا تھا۔ شاہ نور پہلے تو حیران ہوا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
''انتظار کر رہی تھیں میرا تم۔''
''کیا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس نے پلکیں اٹھا کر اک غصیلی نگاہ اس پر ڈالی۔
''اتنی بے شرم دلہن آج تک نہیں دیکھی۔ ادھر تو عورتیں شرم و حیا کی وجہ سے دو' دو سال کلام نہیں کرتیں شوہر سے اور۔'' شاہ نور آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھر کر اس کے سجے سنورے روپ کو نگاہوں کے راستے دل میں اتارا۔ رحاب غصے سے کھول اٹھی تھی تاہم کہا کچھ نہیں۔ شاہ نور کی پرشوق نظروں کی حدت نے

اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''خیر جیسی بھی ہو مجھے قبول ہو۔'' وہ ایک دفعہ پھر اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

''کیا مطلب۔'' رحاب نے اس کی توقع کے عین مطابق مشتعل ہو کر تیکھے انداز میں پوچھا تھا۔

''اب لگ رہی ہو میری رحاب۔'' شاہ نور نے اس کا نرم ملائم ریشمی ہاتھ پکڑ کر ہولے سے دبایا۔

''بہت باعتماد' نڈر تھوڑی غصیلی' انتہائی نرم دل وحساس' کچھ کچھ لڑاکا بھی۔'' وہ دھیمے بوجھل لہجے میں کہتا ہوا رحاب کے دل کی دھڑکنیں منتشر کر گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے شفاف قطرے جگمگانے لگے تھے۔

''وہ پل' وہ گھڑی گویا میرے دل پر نقش ہو گئی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی پسند اپنی محبت پر فخر محسوس ہوا تھا۔ جب تم پریشانی کے عالم میں اک معمولی سی عورت کی خاطر عرش جیسی بے حس ڈاکٹر سے جھگڑ رہی تھیں اسے احساس دلا رہی تھیں۔ اس پل مجھے اپنے انتخاب پر کس قدر اطمینان کا حساس ہوا تھا مگر پھر تم نے وہ انکشاف کر دیا جس نے میرے حواس معطل کر دیئے تھے۔ میں اپنے باپ اور اس سے جڑے تمام رشتوں سے کسی حد تک نفرت کرتا رہا ہوں۔ اس پل مجھے تم سے بھی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اگر تم عورت نہ ہوتیں تو شاید میں تمہیں نہ چھوڑتا۔ میں انتہائی بے حد اور وحشی ہو رہا تھا۔ تمہیں کھو دینے کا دکھ ایک طرف اپنی محرومیاں' ماں کی بے رونق آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھ' وہ درد اذیتیں میرے اندر طوفان کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ اپنے ٹوٹے جذبات کی کرچیاں سمیٹتے گھر آیا تو اماں کو اپنے کمرے میں بے حس و حرکت پا کر میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اپنی اب تک زندگی میں' میں نے کبھی اماں کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھے تھے مگر اس وقت اماں رو رہی تھیں اور بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

اتنا بڑا دھوکا دیا تو نے مجھے گل' میرے اعتماد کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ انہوں نے وہ تمام رسیدیں میری طرف بڑھائیں جو تم میرے کمرے میں رکھ گئی تھیں۔ اس وقت تمام تلخ کڑوی حقیقتوں کو جان لینے کے بعد میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اماں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں انہیں اسلام آباد لے چلوں مگر میں سنی ان سنی کرتا' فل لوڈڈ پستول لئے اس عورت کا قصہ تمام کرنے نکل گیا جس نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر وہاں جا کر پتا چلا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میرا انتقام قدرت نے لے لیا تھا۔ میرے اندر بھڑکتی آگ پر چھینٹے پڑنے لگے تھے۔ پھر جب میں اماں کو لئے اپنے باپ سے ملنے آیا تو میرے دل کی دھرتی سیراب ہو گئی میں شرمندہ ہوں کہ حقیقت جانے بغیر ان سے نفرت کرتا رہا وہ خود ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔'' وہ ہولے سے بڑبڑایا اور گہری سانس کھینچتا کھڑا ہو گیا۔

''تم تھک گئی ہو رابی' چینج کر کے ایزی ہو جاؤ۔'' وہ نرمی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ رحاب بمشکل لہنگے کو سنبھالتے ہوئے اٹھی تھی۔ پھر جب وہ چینج کر کے واپس آئی تو شاہ نور کو پلنگ پر لیٹے دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پلنگ تک آئی اور آہستگی سے سمٹ کر دراز ہو گئی۔ شاہ نور نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔ وہ اس کے قریب سمٹی سمٹائی قدرے بے چین سی تھی۔ شاہ نور نے مسکراتے

ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔
''سونے لگی ہو یار! ابھی تو...... تم کو اپنے دل کی حکایتیں بھی سنانی ہیں۔'' رحاب کے کان کے قریب سرگوشی نما آواز ابھری تھی۔ دوسرے ہی پل شاہ نور نے اس کے لرزتے کانپتے وجود کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے حلقے میں لے لیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ آنے والی صبح بہت روشن تھی۔ وادی دیامیر کا گوشہ گوشہ اس ملن پر جھوم اٹھا تھا۔

☆☆☆

سپیدی سحر نمودار ہو رہی تھی۔ دھند چھٹنے کے بعد کا منظر انتہائی دلکش وحسین تھا۔ پشمینہ نے دبیز پردے ہٹا کر باہر سے آنے والی تازہ مہکتی ہوئی ہوا کو اندر آنے کی گویا اجازت دی تھی۔

ان کا دل خوشی کے احساس سے لبریز تھا اپنے بیٹے کو اس کی خوشی کی سونپ کر وہ بے انتہا مطمئن تھیں۔ انہیں امید تھی' یہ یقین کامل تھا کہ شاہ نور اور رحاب بسری گاؤں کی قسمت بدل دیں گے۔ جنہیں اللہ کے بندوں سے پیار ہو' جو اس ذات پاک کی پیدا کی گئی مخلوق کے درد کو اپنا درد سمجھیں اللہ کی ان لوگوں پر خاص رحمت ہوتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی راہوں میں صرف اور صرف کانٹے بکھیرتے ہیں۔ گل بینا بھی دل کے راستوں پر اندھا دھند بھاگتی انجام سے بے گانہ انتہا پسندی کی آخری حدود تک پہنچ گئی تھی جہاں سے صرف اور صرف تباہی اور بربادی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہونے کے باوجود وہ بچ گئی تھی جبکہ ڈرائیور موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ گل بینا کو معمولی سی خراش تک بھی نہیں آئی تھی۔ کچھ خوف وصدمے کی وجہ سے وہ تین چار دن بے ہوش ہسپتال میں رہی تھی۔ اپنا بچ جانا اسے معجزہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ گل بینا کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ اس کی زندگی کو اللہ نے اس کیلئے سزا بنا دیا ہے۔ ہسپتال سے گھر آئی تو عرش پہلے سے ہی موجود تھی۔ ماں کے آنے کے ایک گھنٹے بعد اس نے تمام چیزیں سمیٹیں اور لڑ جھگڑ کر ان کے کالے کرتوتوں کے پردے فاش کئے ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔ شاہ نور سے مایوس ہو کر اس نے پچپن سالہ سرجن فرید کے ساتھ کورٹ میرج کر لی تھی ماں کو بتائے بغیر۔ گل بینا ہونق دو سی اسے جاتے دیکھتی رہیں پھر جب چکراتے سر کو تھامتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھیں تو خالی درازیں اور لاکر کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''ذلیل بے حیا' کمینی سب کچھ لے گئی' بے غیرت باپ کی بے غیرت اولاد۔'' انہوں نے غصے کے مارے اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے اکلوتی بیٹی کے یوں چلے جانے کے بعد بھی ان کے ہوش وحواس قائم دائم تھے۔ اپنے خوبصورت گھر میں پاگلوں کی طرح چلاتے ہوئے وہ اپنے حواس کھو جانے کی دعائیں کرتی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے عقل وشعور نہ چھین کر عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا تھا۔

تمام ملازم بھی ایک ایک کر کے چلے گئے تھے اب وہ تھیں اور ان کی تنہائی۔ باقی کی زندگی اسی طرح

پچھتاوؤں کی آگ میں جلتے ہوئے گزرنی تھیں۔

''خانم! ام اب گل مینا بی بی کے پاس نہیں جائے گا۔ ام کو اس سے ڈر آتا ہے۔ ام ادھر آپ کی خدمت کرے گا۔'' پلوشہ ڈیڑھ مہینے پہلے ایبٹ آباد سے بسری آگئی تھی۔ اسی نے ہی پشمینہ کو گل مینا کے متعلق بتایا تھا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے پلوشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ چوم کر بھاگ گئی تھی۔

پشمینہ نے یونہی چہرے کو انگلیوں کی پوروں سے چھوا تو بہت سے آنسوؤں کے قطرے ان کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے؟ انہوں نے کھڑکی بند کر کے پردے ایک دفعہ پھر گرا دیئے۔ اب وہ فراز کا انتظار کر رہی تھیں جو شاہ نور کے ساتھ ڈیرے گئے ہوئے تھے۔

☆☆☆

آگہی

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی آمد آمد تھی اور شروع سے ہی ہمارا یہ معمول تھا کہ مہینے بھر کا اکٹھا راشن لے آتے تھے۔ بجلی اور گیس وغیرہ کے بل جمع کروانے آئی تو سوچا کہ رمضان سے پہلے پہلے ہی سودا سلف لے چلوں۔ مگر یوٹیلٹی اسٹور پر اک لمبی قطار اور پسینے سے شرابور خواتین کو دیکھ کر مجھ پر گھبراہٹ طارق ہو گئی تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ اگر دو چار دن مزید نکل جاتے اور رمضان کے پہلے عشرے میں ہی قیمتوں نے عروج پر پہنچ جانا تھا اور دکانداروں کی ''مہربانی'' سے بجٹ خراب ہونے کا شدید خدشہ لاحق تھا۔ اسی لئے گرمی کی پروا کئے بغیر میں نے سودا سلف خرید لیا۔

واپسی پر اپنی چار سالہ بیٹی بسمہ کیلئے چپس، نمکو، بسکٹ اور کینڈیز کی شاپنگ کرکے جوں ہی میں نے ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں تو بلیک کرولا کی طرف بڑھتے ان دو نفوس کو دیکھ کر میں گویا ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ منوں کے حساب سے بوجھ لادے پھولی سانسوں کے ساتھ میں بمشکل سڑک کراس کرکے بلیک کرولا کی طرف بڑھی تھی مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ سرعت سے گاڑی میں بیٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے کرولا میری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔

''انہوں نے مجھے دیکھا نہیں یقیناً۔'' خود کو تسلی دے کر میں نے قریب کھڑی ٹیکسی میں سامان رکھا اور ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ گھر آکر میں نے تمام تھیلے شیلف پر پٹخے اور خود کارپیٹ پر ڈھے گئی۔ بسمہ اپنی شاپنگ دیکھنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

''ماما! چاکلیٹ تو آپ لائی نہیں ہیں۔''

کچھ دیر بعد بسمہ کی خفا خفا سی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔

''سوری بیٹا! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ رات کو بابا کے ساتھ مارکیٹ جا کر لے آنا۔'' میں نے تھکی تھکی آنکھوں کو بمشکل کھول کر کچھ دیر پہلے دیکھے گئے منظر کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔ بسمہ کھل سی اٹھی۔

''ڈھیر ساری چاکلیٹس ۔'' میں نے اس کی چمکتی آنکھوں میں چھپی خوشی کو محسوس کر کے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ بسمہ ایک دفعہ پھر مصروف ہو چکی تھی۔ میں نے اطمینان سے ٹی وی بند کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
دو گھنٹے کی بھرپور نیند لینے کے بعد میں بالکل فریش تھی۔ صبح کے بکھرے پھیلاوے کو سمیٹ کر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ عذیر کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اسی لئے میں نے سرعت سے سبزی وغیرہ چھیلی کاٹی ' آٹا گوندھا۔ چاول چن کر بھگوئے۔ جب تک عذیر آئے کھانا تیار تھا۔
برتن ڈائننگ ٹیبل پر سجا کر میں نے اپنا حلیہ درست کیا۔ عذیر' بسمہ کو مارکیٹ کا چکر لگوا کر لائے تو میں فون سننے میں مصروف تھی۔
''آپی کا فون ہے۔'' میں نے عذیر کے پوچھنے پر اشارے سے بتایا تھا۔ آپی ہفتے میں ایک دو دفعہ فون کر کے میرے خیریت ضرور پوچھتی تھیں۔ لندن میں رہنے کے باوجود وہ یہاں کے حالات سے مکمل باخبر رہتی تھیں۔ میں نے عامر (بھائی) کے بیٹے سرخیل کی طبیعت کے متعلق پوچھا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں سے میرا رابطہ عامر سے نہیں ہوا پایا تھا۔ آپی مجھے الجھی الجھی سی لگی تھیں۔ انہوں نے فون بھی ذرا جلدی ہی بند کر دیا تھا۔ اگلے دن صبح صبح ہی آپی کا فون آ گیا تھا۔ میرے بتانے پر کہ عذیر آفس چلے گئے ہیں۔ انہوں نے اطمینان سے بھرا سانس خارج کیا تھا۔ میں چونک گئی۔ آپی کا انداز کچھ پراسرار سا لگا تھا مجھے۔
''سنو آمنہ تم ابو جی کی طرف نہیں گئی ہو......'' میں نے ازلی سستی سے ایک لمبی جماہی لی اور قدرے پھیل کر صوفہ پر بیٹھ گئی۔
''کہاں آپی وقت ہی نہیں ملتا۔ سو بکھیڑے ہیں گھر کے۔ ابھی پندرہ دن پہلے عذیر کی آپا پورے پچیس دن رہ کر گئی ہیں' پھر بسمہ کو بخار نے آ گھیرا تھا۔ اسی لئے جا ہی نہیں سکی میں۔''
میں نے کچھ شرمندہ ہو کر تفصیل سے بتایا تھا۔ آپی کئی لمحے خاموش رہیں۔ میں نے چونک کر ریسیو کو گھورا۔
''آمنہ! آج ذرا ٹائم نکال کر ابو جی کی طرف جانا اور ہاں عذیر کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ رہی ہونا میری بات۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک اور جماہی لی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے میں ایک دم ہی ٹھٹکی تھی۔
''آپی کیا بات ہے؟'' میں فکرمندی سے بولی۔ آپی نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد قدرے رازداری سے کہا تھا۔
''آمنہ ذرا تحمل سے میری بات سننا۔''
انہوں نے گویا پیش بندی کیلئے مناسب الفاظ چنے تھے۔ وہ میری غصیلی' ضدی اور بے حد جذباتی طبیعت سے واقف تھیں۔ آپی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میرا فشار خون بلند ہونے لگا تھا۔
''بات یہ ہے کہ......''
انہوں نے گویا میرے سر پر دھماکہ کیا تھا۔ کئی لمحے تو میں کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ زبان لگتا تھا کہ تالو

کے ساتھ چپک گئی ہے۔ آپی نے فون بند کیا مگر میں انہیں اللہ حافظ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

مارے غصے' کوفت جھنجلاہٹ کے میرا برا حال تھا۔ شدید اشتعال کے عالم میں' میں نے بال نوچنے شروع کر دیئے۔ چیزیں پٹخیں' کچھ اور نہیں تو بسمہ کو دو تین جھانپڑ رسید کئے۔ اسی غائب دماغی اور غصے کی حالت میں سالن بھی جلایا۔ عذیر کے ساتھ بھی جھڑپ ہو گئی تھی۔ بسمہ کی مار دھاڑ کی وجہ سے۔

ان دن شاید تیسرا یا چوتھا روزہ تھا جب میں نے افطاری کی تیاری کر کے بسمہ کو عذیر کے حوالے کیا اور ٹیکسی پکڑ کر ابو جی کی طرف آ گئی۔ یہاں آ کر جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا تھا اور جو کچھ میں نے سنا کسی بھی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اک لمحے کو تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ تقریباً پچاس سے پچپن کے درمیان خاتون تھیں جو کہ نہایت اطمینان سے پکوڑوں کیلئے شاید آمیزہ تیار کر رہی تھیں اور ابو جی بے حد خوشدلی کے ساتھ پیاز کاٹ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اک لمحے کیلئے وہ دونوں ہی ساکت رہ گئے تھے۔

''یہ سب کیا ہے۔ ابو جی......''

میرے اعصاب چیخ گئے تھے اور آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔ ابو جی میرے لب و لہجہ کو سن کر اور غصیلے تنے تنے تاثرات کا جائزہ لے کر قدرے شرمندہ سے ہو گئے تھے جبکہ وہ خاتون نہایت محبت سے میری طرف بڑھی تھیں۔

''یہ آمنہ ہے۔'' انہوں نے ابو جی سے شاید تصدیق کی تھی۔ میں نے ان کے بڑھتے ہاتھ کو جھٹک دیا تھا اور رخ بدل کر ابو جی کے قریب چلی آئی۔

''اس عمر میں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی ابو جی! کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا آپ نے ہمیں۔ آج مجھے پتا چلا ہے کل سب کو خبر ہو جائے گی۔ کس کس کو جواب دیں گے ہم اور میرے سسرال والے کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے اف۔ مجھے تو سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی ہے......'' میں تقریباً چلاتے ہوئے بولی تھی۔

''میں نے کون سا گناہ کیا ہے۔'' ابو جی آہستگی سے بڑبڑائے تھے۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں تیزی سے پلٹی اور دروازہ عبور کر گئی۔ اگرچہ ابو جی مجھے روکنے کی غرض سے میرے پیچھے آئے تھے مگر میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

گھر آ کر بھی میں بھوکی پیاسی پڑی رہی۔ عذیر میرے سرخ چہرے کو دیکھ کر بھی نہیں بولے تھے۔ خاموشی سے انہوں نے بسمہ کو کھانا کھلایا اور پھر کارٹون لگا کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ کافی دیر تک مجھے برتنوں کی اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو جی اس عمر میں ایسا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اصل پریشانی تو یہ تھی کہ میں عذیر کا سامنا کس طرح کروں گی۔'' انہی الجھی الجھی سوچوں میں گم میں تکیے میں سر دیئے پڑی تھی کہ عذیر میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئے۔

''کیا بات ہے آمنہ! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔''
انہوں نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے رخ بدل کر عذیر کی طرف دیکھا۔
''کیا میں انہیں بتا سکوں گی؟'' میں نے آزردگی سے سوچا۔
''کبھی نہیں...... '' میں دل میں مضبوط ارادہ کر چکی تھی۔ اسی لئے عذیر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔
''ہاں بس سر میں ہلکا سا درد ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔
''اتنی اچھی خبر سن کر تو درد ورد بھول جانا چاہئے تھا تمہیں......''
عذیر کا لہجہ اگرچہ سادہ تھا مگر الفاظ۔
''کون سی خبر......'' میرا سانس حلق میں اٹک چکا تھا۔ عذیر کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔
''یہی کہ ہمارے سسر محترم خیر سے شادی کر چکے ہیں۔''
''آپ کو کس نے بتایا ہے؟'' میں نے ہونق پن کی انتہا کر دی تھی۔ عذیر اس دفعہ کھل کر مسکرائے تھے۔
''یعنی کہ حد ہی ہو گئی ہے۔ پتا پتا بوٹا بوٹا جانے ہے۔ بس ہم ہی نہ جانیں۔ کیوں محترمہ اس قدر بے خبر سمجھ رکھا ہے آپ نے ہمیں۔''
عذیر کا انداز چڑانے والا نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کا لہجہ تمسخر اڑاتا محسوس ہوا تھا۔
''اڑا لیں مذاق آپ بھی، ابھی تو نہ جانے کس کس کی باتیں سننی ہیں۔''
میں نے نم پلکوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑا۔
''تم رو کیوں رہی ہو؟'' عذیر نے حیرت سے مجھے سوں سوں کرتے دیکھا تھا۔
''تو کیا لڈو بانٹوں، جشن مناؤں۔'' میں چڑ کر گویا ہوئی تھی۔ عذیر کے ہونٹوں کا تبسم غائب ہو گیا۔
''تم خواہ مخواہ رو دھو رہی ہو، بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ انکل کی تنہائی دور ہو گئی ہے۔ پچھلے تین چار سالوں سے وہ کس قدر چپ چپ اور آزردہ سے رہنے لگے تھے۔ ابھی چند روز پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان کی صحت کی بحالی اور چہرے کی شگفتگی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر جلد ہی ان کے مزاج میں تبدیلی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی۔ بڑھاپے میں تنہا رہنا کس قدر مشکل ترین کام ہے۔ پھر ان کے ساتھ تو دیگر مسائل بھی تھے۔ نہ وقت پہ کھانا نہ دوا وغیرہ......''
عذیر نہ جانے کیا کہہ رہے تھے میں آنکھیں موندے ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگی تھی۔
امی کے جانے کے بعد ابو جی نے ہم تینوں کو ماں بن کر پالا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹی سی تھی تو ہر وقت امی کیلئے رویا کرتی تھی۔
سارا دن آپی مجھے گود میں اٹھائے سارے گھر میں چکراتی رہتیں یا پھر سڑک پر لے کر نکل جاتی تھیں۔ جب ابو جی گھر آتے تو آپی کی ڈیوٹی گویا ختم سی ہو جاتی تھی پھر میں ہوتی تھی یا پھر ابو جی۔

وہ مجھے مارکیٹ لے کر جاتے۔ کبھی پارک اور کبھی لان میں لگے جھولے پر بٹھا کر جھولا جھلاتے۔ رات گئے تک میں ان کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ خاندان والوں کے بے حد مجبور کرنے پر بھی انہوں نے دوسری شادی کی ہامی نہیں بھری تھی۔ جب بھی پھپھو وغیرہ شادی کیلئے دباؤ ڈالتیں ابو جی کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

''آپا میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے سوتیلی ماں کے سائے تلے احساس کمتری کا اور نفرتوں کا احساس لے کر بڑے ہوں۔ میں انہیں مکمل اور خود اعتماد دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ابو جی کے بے تحاشا لاڈ پیار نے مجھے کسی حد تک خود پسند اور ضدی بنا دیا تھا جبکہ میرے برعکس عامر اور آپی بے حد نرم مزاج کے مالک تھے۔ اسی لئے شاید ابو جی کی شادی کا سن کر انہوں نے کوئی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا جبکہ میں ابھی تک غصے اور جذباتی پن کی وجہ سے کھول رہی تھی۔ یہ سچ تھا کہ ابو جی نے ہمارے لئے بہت سی قربانیاں دی ہیں اور بیہاد بے والدین ہی اپنی اولاد کی خاطر یہ سب کرتے ہیں۔

عذیر کے سمجھانے کا الٹا اثر ہوا تھا۔ مجھے ابو جی کی بیوی سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے آپی تک بھی اپنے خیالات پہنچا دیئے تھے۔ آپی نے بھی کم وبیش عذیر کی طرح نصیحتیں کی تھیں۔ میں جلتے بھنتے سنتی رہی۔

''آمنہ ایک لحاظ سے ابو جی نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھو نا میں اور عامر آٹھ سال سے لندن میں ہیں جبکہ تم ایک شہر میں ہونے کے باوجود مہینوں ابو کی خبر نہیں لے سکتی ہو۔ اب کم از کم ہمیں ابو جی کی تنہائی کا سوچ سوچ کر پریشان تو نہیں ہونا پڑے گا۔''

میں نے آپی کو مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر فون پٹخ دیا تھا۔ عذیر صبح سے مجھے ابو جی کی طرف چلنے کا کہہ رہے تھے میں ہر دفعہ ہی یوں ظاہر کر دیتی تھی کہ جیسے سنا ہی نہ ہو۔ عذیر کے اصرار پر میں نے اپنے ذہن میں پنپنے والے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق سوچا تھا۔

مجھے تیار ہوتا دیکھ کر عذیر مطمئن ہو گئے تھے۔ بسمہ کو تیار کر کے میں نے بیگ میں چند کپڑے رکھے اور دروازے لاک کر کے نیچے اتر آئی۔

گھر کے سامنے گاڑی رکی تو میں بسمہ کو اٹھا کر اندر چلی آئی تھی جبکہ عذیر گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے لگے تھے۔

میں نے اپنے ذہن میں ان الفاظ کو ایک دفعہ پھر سے ترتیب دیا تھا جو کہ مجھے ابو سے کہنے تھے۔ جوں ہی میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اندر سے آتی آوازوں نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''پچھلا رمضان انتہائی تکلیف کے عالم میں گزرا تھا۔ نہ سحری بنا سکتا تھا نہ ہی افطاری کی تیاری ہو سکتی تھی مجھ سے۔ ہوٹل کے کھانے کھا کھا کر پیٹ الگ خراب ہو گیا تھا۔ بیٹیوں کو اس لئے نہیں بتاتا تھا کہ وہ پریشان ہو جائیں گی۔ پھر نائلہ تو تھی بھی بہت دور...... اور آمنہ کو اس لئے زحمت نہیں دیتا تھا کہ ایک تو اس کی بچی بہت چھوٹی تھی۔ دوسرے وہ کام کاج کی اتنی عادی بھی نہیں تھی۔ اپنے گھر بار کے بکھیڑوں کے علاوہ ادھر آ کر

کام کرنا اس کیلئے بہت مشکل تھا۔ کچھ نائلہ نے اور میں نے اسے بہت لاڈ پیار دیا ہے۔ مجھے تو پریشانی ہوتی تھی یہ سوچ سوچ کر آمنہ اپنے گھر کو کیسے سنبھالے گی۔''

ابو جی کی محبت میں ڈوبی آواز نے میرے منہ پر طمانچہ سا مارا تھا۔ میں سن سی کھڑی رہ گئی۔

''اچھا اب باقی باتیں راستے میں بتا دیجئے گا۔ ابھی تو چلیں دیر ہو رہی ہے۔'' مائرہ بیگم بولیں تو میرے ساکت وجود نے گویا حرکت کی تھی۔ میں تیزی سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ابو جی نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے سے تاثرات ان کے چہرے پر امڈ آئے۔

''ارے میری گڑیا آئی ہے۔'' انہوں نے محبت سے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ مائرہ بیگم بھی ہاتھوں میں ڈھیروں شاپرز پکڑے باہر نکلی آئی تھیں۔ ان کے تاثرات بھی کم و بیش اسی قسم کے تھے۔

''ہم تو عیدی دینے آ رہے تھے۔'' عذیر بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے جھک کر مائرہ بیگم کو سلام کیا تھا۔ مائرہ بیگم نے عذیر کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''ہم اپنی عیدی خود ہی لینے آ گئے ہیں کیوں بیٹا۔''

عذیر نے ابو جی کی گود میں چڑھی بسمہ سے کہا۔ اس نے فوراً سر ہلایا تھا۔ سب ہی مسکراتے ہوئے لاؤنج میں آ گئے تھے۔

میں بھی مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی۔ مائرہ بیگم تمام شاپرز رکھ کر کچن میں گھس گئی تھیں۔ روزہ کھلنے کا وقت ہونے والا تھا جبکہ تیاری بالکل ہی نہیں تھی۔ عذیر نے مجھے صوفہ پر جمے دیکھ کر خفگی سے گھورا۔

''آنٹی کی ہیلپ کرو......'' میں کچھ شرمندہ سی اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی اور پھر کباب فرائی کرتی مائرہ بیگم سے گلے ملتے ہوئے مجھے عذیر اور ابو جی نے بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔ میں نے پلکیں جھکائے جھکائے ''سوری'' کہا تھا اور مائرہ بیگم نے مجھے خود سے مزید قریب کر لیا۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ میرے منہ سے کوئی انتہائی غلط بات نہیں نکل سکی اور میرا مقام اب بھی ابو جی کی نظروں میں پہلے جیسا ہے۔ میں تمام شیطانی خیالات اور منصوبوں کو جھٹک کا آٹا گوندھنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ بھلا میں ابو جی سے یہ کہہ سکتی تھی۔

''آپ مائرہ بیگم کو چھوڑ دیں......اور میں آپ کی دیکھ بھال کرنے کیلئے یہیں رہوں گی۔'' بیگم ساتھ لانے کا بہانہ بھی خوب مل گیا تھا۔

''ابو میں عید ادھر ہی کروں گی۔''

میرے چند الفاظ نے ابو جی کی آنکھوں کی جگمگاہٹوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ میں اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر سرشار سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کیسے کیسے لوگ

تم نہ ہوتیں تو میں ان دیواروں سے ٹکریں مار مار کے شاید مر ہی جاتی کون ہے اپنا جو احساس کرے، دکھ سکھ بانٹے۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو کوئی پانی پلانے والا نہیں ہوتا۔

''محسن بے چارے سارا دن آفس میں سر کھپا کر آتے ہیں اور پھر گھر کے ''پھیلاوے'' کو بھی انہیں ہی سمیٹنا پڑتا ہے۔'' الماس باجی سر پہ دوپٹا باندھے انتہائی رقت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ نادیہ کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو بھر آئے باجی کی بے بسی کے احساس سے۔ اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا۔

''میں ہوں نا......''

''تم ہو' اسی لئے تو آرام سے بستر توڑ رہی ہوں۔ ورنہ بخار میں بھی کہاں چین تھا۔ بچے گھر اور تمہارے بھائی جان کی چیخ چیخ مزید بے حال کر دیتی تھی مجھے۔'' انہوں نے بھی جواباً اس سے بڑھ کر محبت کا مظاہرہ کیا۔

نادیہ انہیں آرام کی تلقین کر کے کچن میں چلی گئی۔ بھائی جان کیلئے بریانی اور بچوں کیلئے کھیر بنا کر فریج میں رکھی۔ باجی کیلئے سوپ تیار کیا۔ بچوں کو کھانا کھلا کر اور برتن سمیٹ کے ہی وہ گھر آئی تھی۔ اماں کا پارہ چڑھ گیا تھا گھڑی کی طرف دیکھ کر۔

''کر آئی ہو مہارانی کی خدمتیں۔'' اماں کے طنزیہ لب ولہجہ کو سن کر وہ بھی بگڑ گئی تھی۔

''اماں کبھی تو بخش دیا کریں۔ اتنی بیمار ہیں باجی' اگر میں تھوڑا بہت کام کر کے ان کا بوجھ ہلکا کر آتی ہوں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ شام کو صبا بھی تو جاتی ہے باجی کے پاس۔ چاچی نے کبھی اسے نہیں منع کیا۔ رات کی روٹیاں اور صبح کیلئے آٹا گوندھ کے آتی ہے وہ' ہم نہیں ان کا احساس کریں گے تو اور کون کرے گا۔''

آخر میں اس کی آواز بھرا گئی اور اماں نے سر پیٹ لیا۔

''سارے جہان کا درد تیرے ہی دل میں آن سمایا ہے کمبخت' چل اٹھ سالن پکا لے تیرے باوا آنے والے ہیں۔'' اماں بکتی جھکتی وضو کرنے چل دیں اور نادیہ نے بھی آنسو صاف کر کے اندرونی حصے کی طرف رخ کیا۔

الماس باجی اس کے تایا کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ دو سال پہلے تایا جی بھی چل بسے تو باجی ہمیشہ کیلئے تایا جی کے مکان میں رہنے کیلئے آ گئی تھیں۔ باجی کیا آئیں گویا بہار ہی اتر آئی تھی ان کے دلوں میں صبا اور نادیہ دونوں ہی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر باجی کے پاس آ جاتیں۔ باجی کی چٹ پٹی باتوں اور رنگا رنگ شگوفوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ باجی اپنے بچپن لڑکپن اور کالج کے قصے خوب مزے لے لے کر سناتیں اور ان کے قہقہوں کے فوارے پھوٹ پڑتے۔ باتیں بھی ہوتی رہتیں اور ان کے ہاتھ بھی چلتے رہتے تھے۔ ادھر کام ختم ہوتا تھا اور ادھر باجی کو نیند کے میٹھے جھونکے آنے لگتے۔ وہ آرام کرنے کیلئے اپنے کمرے میں گھس جاتی تھیں اور یہ دونوں اپنے گھروں کی طرف چل پڑتیں۔

اماں کو اس کا الماس باجی کی طرف بھاگ بھاگ کر جانا اور چوبیس میں سے نصف گھنٹے ادھر گھسے رہنا پسند نہیں تھا اور جب سے اس نے نجف بھائی کا لایا ہوا رشتہ ٹھکرایا تھا اماں کے ماتھے کے بل ہی کم نہیں ہوتے تھے۔ وہ لاپروائی سے اماں کی جھڑکیاں سنتی رہتی۔

☆☆☆

اس دن بھی اماں کسی کی عیادت کیلئے گئی تھیں تو وہ دروازے لاک کر کے باجی کی طرف آ گئی۔ گیٹ پر ہی طارق سے سامنا ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا جب کہ نادیہ نے خونخوار نظروں سے اس کبوتری کو گھورا اور دھپ دھپ کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ طارق نے ہاتھ میں موجود کبوتری کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور زیر لب مسکراتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ نادیہ کو الماس کا دیور ذرا پسند نہیں تھا آوارہ اور نکما۔ سارا دن کبوتروں کی سیوا کے بہانے چھت پر چڑھا آنکھیں سینکتا رہتا تھا۔

''بھلا باجی کو کیا ضرورت تھی اس نمونے کو ساتھ لانے کی۔'' اس نے تنفر سے سوچا اور باجی کو آوازیں دیتی دوسرے صحن میں آ گئی۔ باجی اچار کیلئے آم کاٹ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرائیں۔

''ارے ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہونا۔'' انہوں نے اطمینان سے اسے چاقو پکڑایا اور تخت پر ڈھیر ہو گئیں۔

''باجی! آپ طارق کو کیوں لائی ہیں ادھر۔'' آم کاٹتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ باجی نے بھرپور انگڑائی لے کر اسے دیکھا تھا۔

''طاری بہت اچھا ہے نادیہ۔ اتنے کام کرتا ہے باہر کے' سبزی' گوشت' آٹا دالیں سب کچھ یہی لاتا ہے۔ میں بازار جاؤں تو پھر دو دن چارپائی سے اٹھ نہیں پاتی۔''

ان کے تفصیل سے بتانے پر نادیہ نے سر ہلایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بچے اسکول سے آ گئے۔ نادیہ نے اونگھتی ہوئی الماس پر نظر ڈالی بچوں کے اسکول بیگ سنبھالے اور پھر تینوں کو باری باری نہلایا۔ جب تک باجی اٹھیں وہ بچوں کو کھانا کھلا چکی تھیں۔ باجی کی تشکر کے احساسات سے آنکھیں نم ہو گئیں۔

''مجھے تم پر فخر ہے نادیہ تم بہت اچھی بہن ہو۔'' باجی کے محبت بھرے ان چند لفظوں نے اسے ہواؤں میں اڑا دیا تھا۔ تعریف کسے بری لگتی ہے اور پھر باجی تو دل کھول کر مقابل کو سراہتی تھیں۔ انہوں نے اس کی ان

پوشیدہ خوبیوں کی بھی تعریفیں کیں جو کہ نادیہ کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھیں۔ ان تعریفوں کا کچھ تو حق ادا کرنا تھا۔ اس نے مشین لگا کر ہفتہ بھر کے کپڑے بھی دھو دیئے۔

''سچ نادیہ! جو بات تم میں ہے وہ صبا میں بالکل نہیں۔ وہ بہت باتونی لڑکی ہے جبکہ تم انتہائی کم گو، معصوم، نازک اور خوبصورت لڑکی ہو۔ جس گھر میں بھی جاؤ گی اجالے بکھیر دو گی ہر طرف بڑا ہی خوش نصیب ہوگا تمہارا ہم سفر۔ جسے تم جیسی دلکش اور من موہن سی دلہن مل جائے گی۔ مجھے تو جیلسی فیل ہو رہی ہے اس بندے سے۔''

الماس نے اس کی ٹھوڑی چھو کر نہایت ہی دلار سے کہا تھا نادیہ کا چہرہ شرم سے لال پڑ گیا۔ باجی کے الفاظ من میں گھنٹیاں بجانے لگے تھے۔ گھر آ کر اس نے کتنی ہی مرتبہ بغور آئینہ دیکھا تھا۔ اماں اسے آئینہ کے سامنے کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''اے...... کیا شکل بدل گئی ہے جو یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کے گھورے جا رہی ہو شیشے کو اب بس بھی کرو حسن آرا بیگم۔''

''اماں آپ بھی نا۔'' اس کے خوابوں کا محل دھڑام سے گرا تھا۔ وہ تو نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی ان چند لمحوں میں۔ اماں نے اسے حقیقت کی تلخ دنیا میں لا پٹخا تھا۔ وہ چڑ کر سامنے سے ہٹ گئی۔

آسمان پر اچانک ہی کالے کالے بادل چھا گئے تھے۔ موسم کے تیور دیکھ کر اس نے سرعت سے صحن میں بکھری چیزیں سمیٹیں۔ چوزوں کو ڈربے میں بند کیا۔ الگنی سے کپڑے اتارے۔ پھر سبزی لے کر تخت پر بیٹھ گئی۔

''نادی۔'' اماں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا تھا۔ وہ بھی اماں کے بدلے بدلے لب و لہجہ کو سن کر چونکی۔

''کاظم کی ماں آج پھر آئی تھی۔ میں نے سوچنے کیلئے وقت مانگا ہے۔ دیکھ بیٹی میں تیری ماں ہوں، اچھا ہی سوچوں گی نا تیرے لئے اور پھر لڑکا بہت اچھا ہے۔ اس کی ماں کو نیک گھرانے کی پیار کرنے والی بچی چاہئے۔ میلاد میں دیکھا تھا انہوں نے تمہیں۔ بہت پسند آئی ہو تم کاظم کی بہنوں کو۔ اسی لئے تو انہوں نے دہلیز پکڑ رکھی ہے ہماری۔ ورنہ کاظم کیلئے رشتوں کی کمی تو نہیں ہے۔ خوبصورت ہے، پڑھا لکھا، اتنی اچھی نوکری ہے اس کی، نجف کہہ رہا تھا کہ خالہ اس سے بہتر رشتہ نہیں مل سکے گا ہمیں اپنی نادی کیلئے۔''

''اماں آپ کو کیا جلدی ہے مجھے اس گھر سے نکالنے۔'' ان کی پوری بات سن کر وہ غصے سے بولی۔ اماں نے خفگی سے اسے گھورا۔

''تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔'' اس نے سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ اماں نے اس کے تیور دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ صبح صبح ہی باجی کی طرف چلی گئی تھی۔ باجی کے پوچھنے پر اس نے اماں کے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ باجی نے تاسف سے سر ہلایا۔

''صاف انکار کر دو نادیہ۔ تم کہاں اتنی لمبی چوڑی سسرال کو بھگتاتی پھروگی۔ سات نندیں' اللہ کی پناہ۔'' الماس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اسے دہلایا۔

''اماں میری بات کہاں مانیں گی۔'' وہ آہستگی سے منمنائی اور سلیب پر رکھا ہرا دھنیا نوچنے لگی۔

''میرا تو دل تمہیں ہمیشہ کیلئے اپنے پاس رکھنے کو تھا۔ تم سے دوری کا خیال ہی آزردہ کر دیتا ہے مجھے مگر اب۔'' الماس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ جب کہ نادیہ نے بھی کچھ چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے پیاز کاٹ کر آنسو صاف کئے۔

''اف میں بھی کن باتوں میں الجھ گئی ہوں۔'' گھڑی کی طرف دیکھ کر انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ دیگچی چولہے پر چڑھا کر کیبنٹ کھولا تو چاولوں کا ڈبا خالی نظر آیا اور کوکنگ آئل بھی تقریباً ختم تھا۔ الماس کی پریشانی دوچند ہوگئی۔

''یہ طاری نجانے کہاں نکل گیا ہے۔ اب میں کسے بھیجوں مارکیٹ۔'' جھنجلاتے ہوئے الماس نے دیگچی چولہے سے اتار کر سلیب پر پٹخی۔

''میں اپنے گھر سے لے آتی ہوں تیل۔'' نادیہ نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ الماس کو اس پر ٹوٹ کے پیار آ گیا تھتا۔

''تم اتنی گرمی میں......'' الماس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ نادیہ بیرونی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ الماس نے کھڑکی میں سے ہانک لگائی۔

''تھوڑے سے چاول بھی لیتی آنا کرن کیلئے کھچڑی بنا دوں گی۔''

''جی اچھا۔'' وہ بھی بلند آواز میں چلائی تھی۔ الماس مطمئن ہوگئیں۔ گیٹ پر کھڑی گاڑی کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔ تن فن کرتی اندر آئی تو اماں سے سامنا ہو گیا۔ وہ شاید اسے ہی بلانے آ رہی تھیں۔

''حلیہ درست کر کے اندر آؤ۔'' خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ پلٹ گئی تھیں۔ اس نے اماں کے بیٹھک میں جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور پھر اسٹور میں گھس گئی۔ چاول نکال کر اس نے اسٹور کو تالا لگایا اور کچن میں آ کر کوکنگ آئل پیالے میں نکالا۔ دروازے میں کھڑی اماں اس کی ساری کارروائی دیکھ چکی تھیں۔ جوں ہی وہ پلٹی اماں کو دیکھ کر رنگ فق ہو گیا تھا اس کا۔

''وہ اماں...... میں۔'' نادیہ ہکلا کر رہ گئی تھی۔ اماں کے پیچھے اور بھی چہرے نمودار ہوئے۔ اس نے بمشکل پھنسی پھنسی آواز میں سلام کیا۔ اسی پل حسن دوڑتا ہوا آ گیا تھا۔

''خالہ لے بھی آئیں چاول' امی انتظار کر رہی ہیں۔''

وہ معذرت کرتے ہوئی حسن کے پیچھے نکل گئی تھی۔ اماں کا سر مارے شرمندگی کے جھک گیا۔ انہیں یہ رشتہ بھی ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ ابھی راحیلہ بیگم ان کی بیٹی کی بدتہذیبی پر باتیں سناتی معذرت کے چند کلمات کہہ کر چلی جائیں گی۔ منوں کے حساب سے بوجھ ان کے کندھوں پر آ گرا تھا۔

''بہت ہی احساس کرنے والی بچی ہے آپ کی۔''

راحیلہ بیگ نے کہا بھی تو کیا۔ انہیں اپنی سماعتوں پر دھوکے کا گمان ہوا تھا۔ مارے خوشی کے آنکھیں جھلملا گئیں۔ انہوں نے سرعت سے اپنے تاثرات چھپائے۔

''اب مزید انتظار نہ کروائیں خالہ جان ہمیں۔'' کاظم کی بڑی بہن بہت خوشی دلی سے بولیں۔

''جمعہ کے مبارک دن ہم انگوٹھی پہنانے آئیں گے۔'' انہوں نے کھڑے کھڑے ہی سب کچھ طے کر لیا تھا۔ اماں کا سر اثبات میں ہلتا چلا گیا۔

نادیہ جان بوجھ کر دیر سے آئی تھی۔ مہمان جا چکے تھے اور وہ جانتی تھی کہ اماں اسے نہیں بخشیں گی۔ مگر گھر آ کر وہ چونک اٹھی تھی اماں کا خوشگوار موڈ دیکھ کر انہوں نے نہ اسے جھڑکا نہ غصہ کیا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے کاموں میں مصروف رہیں۔

☆☆☆

شام کو ابا آئے تو اماں نے اسے چائے بنانے کا حکم دے دیا۔ ابا نے کبھی اس وقت چائے نہیں پی تھی۔ وہ جلتی بھنتی کچن کی طرف چل دی۔ رات تک اسے اماں کے معرکے کی خبر مل گئی تھی۔ اس کی اور اماں کی خوب جھڑپ ہوئی۔ اس نے غصے سے کھانا بھی گول کر دیا۔ رات بھر بھوکی پیاسی روتی رہی۔ صبح اٹھ کر الماس باجی کو اماں کی کارروائی کی سب سے پہلے رپورٹ دی۔ باجی نے صبا کو بھی بلوا لیا تھا۔ دونوں نے مل کر اسے خوب تسلیاں دلا سے دیئے۔ وہ سوں سوں کرتی سنتی رہی۔ آج اُس کا باجی کی طرف رہنے کا ارادہ تھا۔ وہ اماں کو بتا کر آئی تھی کہ وہ اب ان کے گھر نہیں رہے گی۔ اماں اس کے بچپنے پر بھنا اٹھی تھیں تاہم کہا کچھ نہیں۔ جانتی تھیں کہ وہ دو گھڑی کا غصہ ہے اس کا سارا دن وہ باجی کے ساتھ مصروف رہی۔ شام کو محسن بھائی خوب لدے پھندے آ گئے تھے۔

''نادیہ چائے بنا لاؤ۔'' محسن بھائی نے اسے آواز دی۔ وہ اٹھ کر چائے بنانے چل دی تھی۔ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی۔ رات کو اس نے خوب محنت کر کے دال چاول بنائے۔ کرن کی فرمائش پر ٹرائفل بھی تیار کیا۔ وہ بچوں کے ساتھ لڈو کھیل رہی تھی جب طارق چلا آیا تھا۔ نادیہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ اٹھ کر جانے لگی تھی جب طارق نے اسے روک لیا۔

''ادھر آؤ......'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر صحن میں لے آیا تھا اور پھر زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ نادیہ نے گھبرا کر اس سے بازو چھڑوانے کی کوشش کی۔

برآمد میں پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کبوتروں کی گندگی' حبس اور بدبو نے ایک ساتھ حملہ کیا تھا۔ نادیہ نے ناک دبا کر اسے گھورا۔

''کیوں لائے ہو مجھے یہاں۔'' وہ غصے سے چیخی۔

''آہستہ بولو۔'' طارق نے نرمی سے ٹوکا تھا اسے اور پھر بدرنگ سی قمیص کی جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لایا۔ وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے ایک دو بٹن چھیڑ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
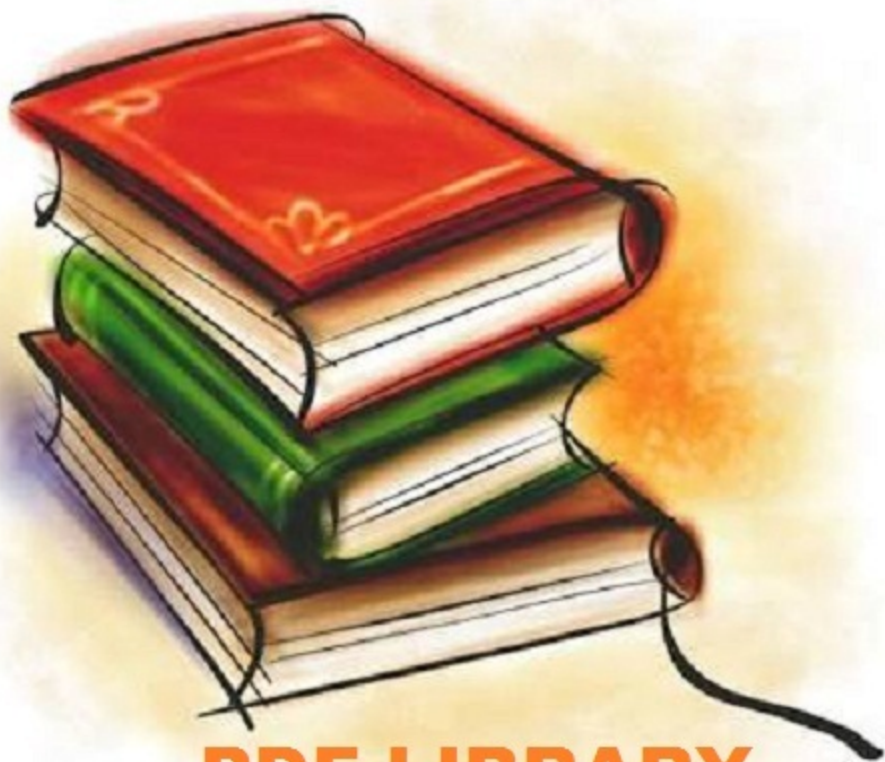
''اس کے اندر وہ چیز ہے جسے سن کر تمہیں فیصلہ کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ صاف شفاف راستوں کو پہچان لوگی تم اور میں بھی یقیناً۔'' وہ پر اعتماد لہجے میں گویا ہوا اور پھر ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا تھا اس نے۔

صرف دو منٹ اور پچیس سیکنڈز نے اس کی پوری ہستی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ فق رنگت کے ساتھ سنتی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے سیلاب جاری ہو گئے تھے۔

''جب میرے کانوں میں یہ زہر اترا تھا مجھے بھی اتنی تکلیف ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہوئی۔ میں بھی اسی طرح رویا تھا۔ جب آنسو تھمے تو میں نے ایک فیصلہ کیا تھا خود کو منوانے کا فیصلہ۔ اپنے وجود کی عمارت کو دوبارہ کھڑا کرنے کا فیصلہ۔ اسی لئے میں نے کپڑے کی مل میں نوکری کر لی ہے۔ پہلی مرتبہ محبت کا ذائقہ محسوس کیا ہے میں نے۔ کل صبح میں نے کراچی چلے جانا ہے۔ یہ امانت تمہارے حوالے کرنا تھی۔'' طارق نے بھیگے لہجے میں کہہ کر ٹیپ ریکارڈر اس کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے تھاما نہیں تھا۔ وہ لرزتی ٹانگوں سے چلتی ہوئی بمشکل زینہ اتری۔ گیٹ کھول کر اس نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

ابھی تک الماس کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس نے کرب سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

اسی پل لائٹ چلی گئی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پاؤں کے نیچے شاید کوئی پتھر آیا تھا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ پاؤں سہلاتے ہوئے اس نے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔ وہ زہر میں بجھی آواز اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

''دیکھیں نا محسن! اتنی تو مہنگائی ہے۔ اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ نوکرانی میں افورڈ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مہینے کے آخر میں لمبے چوڑے بلوں کے ساتھ ایک اور اضافی خرچہ۔ ابھی تک تو نادیہ سے کام کرواتی آئی ہوں۔ صبا بھی فلمیں دیکھنے اور باتوں کے چسکے کیلئے آ جاتی ہے۔ مگر کب تک۔ اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ طارق کے ساتھ نادیہ کی شادی کروا دوں۔ مفت میں سارے کام بھی ہو جائیں گے اور طارق پر احسان الگ۔ ویسے بھی نادیہ جیسی عام سی شکل وصورت والی لڑکی کے ساتھ طارق ہی ٹھیک رہے گا۔ اس کی ماں کے مزاج تو نہیں ملتے مگر لڑکی کو میں قابو کر لوں گی اور رہا طارق تو اس نکھٹو کو ہمیشہ کیلئے دبانے کا واحد علاج بھی یہی ہے۔''

الماس بڑے کروفر کے ساتھ پلاننگ کر رہی تھیں۔ نادیہ نے سر اٹھایا تو ننھی منی سی روشنی چہرے پر پڑی۔ وہ گھبراتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ دوپٹا سے چہرے صاف کرکے اس نے پنی طرف بڑھتے ہیولے کو بغور دیکھا۔ وہ پہچان چکی تھی کہ ٹارچ ہاتھ میں پکڑے بے قراری سے اس کی طرف آنے والا کون ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے اماں کے سینے سے جا لگی تھی۔

''میری بچی میں تجھے لینے کیلئے آ رہی تھی۔ اندھیرے میں کیوں نکلی اور وہ بھی اکیلے۔ یہ الماس بھی نا۔''

وہ اس کا سر منہ چومتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں جب کہ اس نے اماں کے ساتھ چلتے ہوئے چپکے سے سوچا۔

''کہاں ہے اماں اندھیرا۔ میں تو روشنی میں آئی ہی اب ہوں۔ دیکھو تو ہر طرف اجالا ہی اجالا ہے۔ اندھیرے تو پیچھے رہ گئے ہیں عاقبت نااندیشوں کے پاس۔

☆☆☆